آپ کے محبوب مصنف کی سسپنس کے ان صفحات پر طویل غیر حاضری کے بعد مخصوص انداز میں آمد

احمد اقبال

ساجن پور کا ساجن

بے روزگاری کا عذاب اب مہذب اور ترقی یافتہ معاشروں کو بھی گھن کی طرح کھانے لگا ہے۔ اس کے باعث پر امن معاشروں میں جرم و زیادتی کی شرح میں اضافہ ہونے لگا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق جب ایک تعلیم یافتہ شخص بے روزگاری کی پر عذاب چکی میں پس رہا ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں تخریبی خیالات کی دراندازی غیر معمولی نہیں ہوتی، اس وقت ذرا سی ترغیب اسے راہ حق سے بھٹکا سکتی ہے۔

زیر نظر کہانی ایسے ہی کردار کے گرد گھومتی ہے جو بے کاری و بے روزگاری سے تنگ آچکا تھا کہ اسے ایک نہایت پرکشش ملازمت کی پیش کش ہوئی تاہم اس دل فریب اور دل خوش کن پیش کش کے جلو میں چند کانٹے بھی تھے جو اسے خود ہی صاف کرنے پڑے۔ اس راہ پر اس پر کیا گزری یہ تو کہانی پڑھ کر ہی معلوم ہوگا۔ ہاں بس اتنا ہے اگرچہ موضوع نہایت سنجیدہ ہے مگر احمد اقبال تو سنجیدہ اور روتے بسورتے عنوانات کے بطن سے بھی ظرافت اور قہقہوں کے طوفان برآمد کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

اس کہانی میں بھی ان کی اس مہارت اور مشاقی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ تو پھر پڑھیے اس ساجن پور کے ساجن کی داستانِ قہقہہ آور اور اس کی سچائیوں کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اترتا محسوس کیجئے۔



اپنے آبائی گھر کی چابی ایک اجنبی کے حوالے کرتے ہوئے ندیم نے خود کو اپنی ہی گلی میں اجنبی اور اپنے ہی شہر میں جلاوطن محسوس کیا اور ان تمام پُرامید خیالات کے باوجود جن سے اس نے ایک موہوم مستقبل کے خوابوں کو سجا رکھا تھا' اس نے اپنے دل میں ایک پُرآزار اداسی کے دورے کی کسک کو محسوس کیا۔

اس گھر کے در و دیوار کے گوشے گوشے میں بسی ہوئی اپنائیت اور ماں کے قرب کی خوشبو جیسی دلدار یادوں کا ہر لمحہ مقفل بند دروازے کے پیچھے اکیلا نوحہ خواں رہ گیا تھا۔ اس کے گزرے ہوئے اور آنے والے وقت کے درمیان جیسے ایک غیر مرئی دیوار حائل ہو گئی تھی۔

وہ اسی گھر میں پیدا ہوا تھا اور اپنی زندگی کی چوتھائی صدی کے ہر دن کی یاد اس بند دروازے کے پیچھے چھوڑتے ہوئے اس کے جذبات کی کیفیت اس احساس سے مختلف نہ تھی جو اسے پہلی بار اپنے والد کی تدفین کے بعد واپس لوٹتے وقت ہوا تھا اور دوسری بار اس وقت جب گورکن نے قبر کا منہ سیمنٹ کی سلیب سے بند کر دیا تھا اور اس کی ماں کا وجود اپنی ممتا کی ساری روشنی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔

لیکن یہ زندگی ہے۔ اس نے دل میں ایک مصنوعی سہارا دینے والی بشاشت کے ساتھ سوچا اور پھر اس شخص سے ہاتھ ملایا جو دروازے کے قفل کی چابی اپنی مٹھی میں دبا کے پرانے مکان کے اسٹرکچر کا قطعی مختلف جذبات کے ساتھ جائزہ لینے میں مصروف تھا اور اپنے تصور میں ایک بالکل مختلف تصویر دیکھ رہا تھا۔

اصولی طور پر ندیم کے آبائی گھر کا سودا طے کرنے سے پہلے ہی وہ اسے گرا کے اس کی جگہ اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق ایک جدید طرز کا گھر بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''آپ کو نیا گھر مبارک ہو'' ندیم نے اس سے ہاتھ ملایا۔

وہ سپاٹ سے انداز میں ہنسا ''نیا گھر؟ وہ تو میں اب بناؤں گا انشاء اللہ' یہ جگہ صاف کرانے کے بعد۔''

کسی وجہ کے بغیر ندیم کے دل میں برہمی اور دکھ کی ایک لہر سی اٹھی ''یہ گھر بھی اچھا تھا۔''

خریدار نے اپنی ایک بالشت جتنی لمبی ریشِ سیاہ پر ہاتھ پھیرا ''ہوگا ایک صدی پہلے' جب یہ بنا ہوگا۔''

ندیم کے ذہن میں بہت سے تند و تلخ جملے آئے۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ گھر اینٹ چونے یا سریے اور سیمنٹ کی دیواروں سے نہیں' مکینوں کے رشتوں کی تقدیس اور ایک خاندان کی تکمیل کے حسن سے خوبصورت بنتا ہے۔ سنگ مرمر کے فرش پر بچھے امپورٹیڈ قالینوں' فانوسوں اور بیش قیمت ڈیکوریشن پیسوں سے بھرے کسی پُرشکوہ قصرِ عالی شان کے اندر رہنے والے اگر مصلحتوں یا مجبوریوں کی وجہ سے ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوں تو وہ قید خانہ ہوتا ہے۔

لیکن اس نے یہ سب کچھ کہنے سے گریز کیا کیونکہ یہ سب اسے بہت پہلے سے معلوم تھا بلکہ وہ تو اس گھر کے نقشے کا بلیو پرنٹ اور اس کے فرنٹ ایلویشن کا ویو بھی دیکھ چکا تھا جو اس کے آبائی گھر کے وجود کو ختم کر کے اس کی زمین پر نئی بنیادوں کے ساتھ کھڑا ہونے والا تھا۔ منڈی میں آلو پیاز کے آڑھتی پشاور کے حاجی گلباز خان نے سودا کرتے ہوئے ندیم کے استحصالی رویے پر ایک احتجاجی مگر پُرتکبر رویے کا کھل کر اظہار کیا تھا ''او یارا! تم بس ہماری مجبوری کی قیمت لے رہے ہو۔''

ندیم نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا تھا ''میں نے آپ کو اس سودے کے لیے بالکل مجبور نہیں کیا۔ اب بھی اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے تو آپ اپنا بیعانہ واپس لے سکتے ہیں۔''

حاجی نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''یہی تو ہماری مجبوری ہے۔ اللہ نے توفیق دی ہے کہ ڈیفنس میں جو کوٹھی [illegible] کھڑے کھڑے خرید لیں مگر یہاں سے منڈی قریب ہے۔''

ندیم نے کہا ''اسی لیے یہاں کی زمین ڈیفنس سے مہنگی ہے۔''

''یہاں میں نیچے اپنا آفس بنا سکتا ہوں۔''

ندیم نے یہ کہنا ضروری نہیں سمجھا کہ اب نیچے آپ اپنا آفس بنائیں یا مزار شریف۔ میری بلا سے' اسے پانچ مرلے کے مکان کی قیمت مارکیٹ ویلیو کے اعتبار سے اچھی مل گئی تھی۔ فہو المطلوب۔ بقول شاعر۔ بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا۔ اب اس میں کوے کا بچہ رہے یا اُلو کا پٹھا۔ اسے کیا فرق پڑتا ہے؟

اس نے اپنا سوٹ کیس ٹیکسی کی چھت پر اور بیگ اس کی ڈکی میں پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ ان میں ندیم کے کپڑے جوتے اور ذاتی استعمال کی تمام چیزیں تھیں۔ لوگوں سے اور ان کی ضروریات کے اسباب سے لبریز گھر میں سے اب صرف یہی بچا تھا۔ ایک وہ خود' دوسرا اس کا سوٹ کیس اور تیسرا بیگ۔ باقی سب کچھ اس نے طلب گاروں میں بانٹ دیا تھا۔ تحفے میں دے دیا تھا اور جو کسی کو مفت لینا بھی گوارا نہ تھا' وہ ایک کباڑی کو دے کر رقم جیب میں ڈال لی تھی۔ وہ جذباتی وابستگیوں کا ایک بے قدر خزانہ تھا جو لُٹ گیا تھا اور اس کے بعد آسیب زدہ خاموشی سے گونجتی دیواروں والا وہ گھر اس تہذیبی عجائب خانے کی طرح رہ گیا تھا جسے کسی وحشی فاتح لشکر نے خالی کر دیا ہو۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف سوا آٹھ ہوئے تھے۔ بس اسٹینڈ کا راستہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کا تھا۔ تاندلیانوالہ براستہ ساجن پور جانے والی بس کی روانگی کا وقت نو بجے تھا۔ چونکہ بس کمپنی ایڈوانس بکنگ اور سیٹ ریزرویشن جیسے تکلفات پر یقین نہیں رکھتی تھی اس لیے پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر محمود و ایاز کو اپنی مرضی سے کہیں بھی تشریف رکھنے کے معاملے میں مکمل خود مختاری حاصل تھی۔ ندیم پر یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ ہر مسافر سے کرایہ موقع واردات پر وصول کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے' ٹکٹ کی خیر ہے۔

اپنی بے سبب جذباتی افسردگی کے چکر میں وہ ٹیکسی والے کو ہدایات دینا بھول گیا کہ وہ لاری اڈے جانے کے لیے مختصر ترین راستے کو چھوڑ دے اور الٹے ہاتھ سے گھوم کے چلے۔ وہ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں تیسری بار نسرین سے آخری الوداعی ملاقات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ یقیناً آج کالج نہیں گئی ہوگی اور گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے ایک پٹ سے لگی کھڑی ہوگی۔ ندیم کو ساجن پور جانے سے روکنے کے لیے اس کے احتجاجی مظاہرے گزشتہ ایک ہفتے سے جاری تھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان میں شدت آتی جا رہی تھی۔ اس نے پہلے ندیم کو اپنی زنانہ منطق کے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر ناز و ادا سے اور اپنی قسم دے کے جذباتی حربے آزما کے اس کا ارادہ بدلنا چاہا تھا۔ پھر وہ دھمکیوں پر اتر آئی تھی جس میں خودکشی کر کے مرجانے' بعد از مرگ بدروح بن کے اس کا پیچھا کرنے اور اسے بھی برباد کر دینے کے عزائم کا اظہار تھا لیکن ندیم نے نہایت سنگدلی کے ساتھ نسرین کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ ہار جانے والی ہر عورت کے آخری حربے کے طور پر تین آخری الوداعی ملاقاتوں میں اس نے اچھے خاصے آنسو بہائے تھے اور جذباتی ڈائیلاگ بولے تھے مگر اس کے لیے وہ پہلے سے تیار تھا چنانچہ صورت حال جوں کی توں رہی تھی۔ صورت حال کو بدلا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ شاعرانہ حقائق کی زبان میں تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے' والی بات تھی۔ وہ نوکری کو ایک غیر عملی سوچ رکھنے والی لڑکی کے جذبات پر قربان نہیں کر سکتا تھا جو ہمہ وقت اپنی خواہشوں کے زرتار جال میں زیادہ سے زیادہ الجھنے اور الجھانے کو ہی مقصدِ حیات سمجھتی تھی۔

اصل بات یہ تھی کہ لڑکی کہیں بھاگی نہیں جا رہی تھی مگر یہ نوکری جو اسے بڑے دھکے کھانے اور بہت جوتیاں چٹخانے کے بعد ملی تھی' اس کے ہاتھ سے نکل جاتی تو بے روزگاری کا دور نہ جانے کتنا طویل ہوتا اور بھیک کی طرح نوکری مانگنے کے لیے اسے کہاں کہاں ہاتھ پھیلانے پڑتے۔ ناامیدی کا عذاب رکھنے والے ہر گزرتے دن کے ساتھ ندیم کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ کوئی سفارش نہ رکھنے کی وجہ سے وہ کتنا بے حیثیت اور اس کی ڈگری والا علم کتنا بے مصرف ہے اور یہ پچھتاوا بڑھتا جا رہا تھا کہ آخر اس نے لوگوں کی باتوں میں آ کے ڈسپنسر اور پھر میڈیکل ٹیکنیشن کے کورس ہی کیوں منتخب کیے تھے۔ سب کہتے تھے اس فیلڈ میں بڑا اسکوپ ہے۔ نوکریاں لوگوں کی منتظر ہیں اور کوالیفائڈ آدمی جس اسپتال میں جائے' ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ شاید پہلے پہل ایسے ہی ہوگا مگر ندیم کے کوالیفائی کرنے تک صورت حال بدل چکی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایم اے ایم ایس سی جھک مار رہے تھے' ڈاکٹر اور انجینئر بے روزگار تھے اور کلرکوں جیسی تنخواہوں پر چھوٹے موٹے اسپتالوں میں نوکریاں کر رہے تھے۔ آئی ٹی والے ہزاروں کی تعداد میں مایوس پھر رہے تھے' ایسے ہی ندیم جیسے سیکڑوں ہو گئے تھے جن کے لیے کہیں کوئی نوکری نہیں تھی۔ اس کے مخصوص علم کی اسپتالوں کے سوا کسی کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ شاید ہر علم اپنی فراوانی اور مقصدیت کے اعتبار سے غیر ضروری ہو گیا تھا۔

چنانچہ مایوسی کے شدید دوروں میں ندیم یہ بھی سوچتا تھا کہ آخر اسے پڑھنے لکھنے میں اتنا وقت گنوانے اور اتنی دماغ سوزی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ وہ مرغ چھولے بنانے کے فن میں مہارت حاصل کرتا اور آج ہزاروں کما رہا ہوتا۔ وہ علم کس کام کا جس سے پیٹ نہ بھرے اور دماغ فرسٹریشن پیدا کرنے والے خیالوں سے بھر جائے۔

لیکن اسی زمانے میں اچانک یہ نوکری اس کے نام کی لاٹری کی طرح نکل آئی جس میں ایک خوشحال اور روشن مستقبل کی کرن تو تھی مگر اس کے لیے لاہور کو اور نسرین کو چھوڑ کے ساجن پور جانا ضروری تھا اور ساجن پور تو بس کے ذریعے دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اگر اسے ہزاروں لاکھوں بے روزگاروں کی طرح اور خوشحالی کے خواب کی تعبیر تلاش کرنے والوں کی طرح دبئی جانا پڑتا تو کیا وہ نہ جاتا۔ ڈالروں کی

نہ کرتا جو طلب گاروں کے لیے عالمِ بالا کی جنت کی طرح ہوگئی تھی جہاں جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔

حسبِ توقع نسرین کسی فریم کی ہوئی تصویر کی طرح کھلی ہوئی کھڑکی کی چوکھٹ میں نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو نسرین کی طرف دیکھے بغیر بھی گزر جاتا مگر ایسا کرنا اچانک اس کے لیے ناممکن ہوگیا۔ اس نے نسرین کو دوپٹے کے پلو سے بار بار آنکھیں صاف کرتے دیکھا تو وہ کھڑکی سے سر نکال کے ہاتھ ہلانے اور خدا حافظ کہنے کے انداز میں ایک ہوائی بوسہ ارسال کرنے پر مجبور ہوگیا۔

جواب میں کھڑکی سے اس کا گورا گداز بازو باہر آیا اور اس نے ندیم کو متوجہ کرنے کے لیے ہاتھ ہلا کے ایک لفافہ باہر پھینک دیا۔ ندیم کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ لفافہ کٹی پتنگ کی طرح لہراتا نیچے آ رہا تھا اور سڑک پر سے صرف گاڑیاں ہی نہیں گزر رہی تھیں، پیدل لوگ بھی آ جا رہے تھے۔

اس نے بڑی ایمرجنسی میں ٹیکسی رکوائی مگر اس کے واپس پہنچنے تک لفافہ ایک زلف دراز اور چاک گریباں ٹائپ ہیرو نے اٹھا لیا تھا اور اب اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مصروف تھا۔

ندیم نے واجبی حد تک شریفانہ لہجے میں کہا ''بھائی صاحب، یہ لفافہ میرا ہے۔''

بیک وقت پان اور سگریٹ نوش فرماتے دبلے پتلے ہیرو نے اسے غور سے دیکھا ''اس پر تو کسی کا نام نہیں لکھا ہوا ہے؟''

''مگر مجھے معلوم ہے، یہ میرے لیے ہے'' ندیم نے کہا۔

''کس نے لکھا ہے؟''

ندیم کے ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا ''ایک لڑکی نے......''

ہیرو نے اسے آنکھ ماری ''پیار کرتی ہے تم سے؟''

''نہیں۔ اس خط میں اس نے مجھے گالیاں دی ہوں گی اور دھمکیاں کہ میں پھر ادھر سے گزرا تو وہ مجھے گولی مار دے گی۔ خط لاؤ ادھر۔'' ندیم نے غرا کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

ہیرو نے ہاتھ پیچھے کر لیا ''اور اگر میں نہ دوں پھر؟''

''پھر میں تمہیں لمبا ڈال کے ایسی چھینٹی لگاؤں گا...''

ندیم کے خطرناک انداز میں آگے بڑھنے سے ہیرو نے سمجھ لیا کہ ناشتے میں مار کھانا کوئی عقلمندی نہیں اور خط اسے تھما دیا۔ ندیم نے لفافہ کھولے بغیر جیب میں ٹھونسا اور ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ یہ ساری کارروائی ٹیکسی ڈرائیور نے بھی گردن باہر نکال کے دیکھی تھی مگر اس نے کوئی سوال کرنے سے گریز کیا اور صرف معنی خیز انداز میں مسکرانا کافی سمجھا۔

ندیم کے لیے خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں، ایک حقیقت تھی۔ نسرین کے پاس ایک ضخیم ڈائری تھی۔ اس میں وہ رسالوں اور کتابوں سے رقت انگیز حد تک رومانی اور ہجر و فراق کے جذبات کی دردناک ترجمانی کرنے والے اشعار نقل کرتی رہتی تھی۔ اردو شاعری کے اس بیش بہا اور زنانہ جذبات کی عکاسی کرنے والے ذخیرے میں الیہ فلمی گانے بھی شامل تھے۔ ڈائری کے نثری حصے میں زنانہ رسالوں کے ایسے پر اثر اقتباسات درج تھے کہ پتھر دل محبوب کو بھی خط میں لکھے جائیں تو اس کا دل پگھل کے پانی ہو جائے، اشک بن کے آنکھوں سے بہہ جائے یا کسی متبادل راستے سے خارج ہو جائے۔

عاشقانہ بلکہ معشوقانہ خط و کتابت کی اس فائل میں جسے ندیم متاعِ حیات کی طرح سنبھال کے رکھنے پر مجبور تھا، زیادہ اثر انگیز پیرے اور خون رلانے والے اشعار کئی بار دہرائے جا چکے تھے اور عام طور پر ایک سہ ماہی میں موصول ہونے والے محبت نامے، نفسِ مضمون اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے تقریباً وہی ہوتے تھے جو اگلی سہ ماہی میں مرتب کیے جاتے تھے۔ بہت سے محبت نامے ندیم نے سرسری نظر ڈال کے یا بن پڑھے ہی الماری کے زیریں خانے میں پھینک دیے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ بجلی گیس کے بلوں کی طرح وہ انہیں تلف بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ نسرین ہر لفافے پر مکتوب الیہ کا نام پتا لکھنے کے بجائے یہ اشعار لکھ دیتی تھی۔

تمہاری بے وفائی پر اگر میں خودکشی کر لوں
تو میرے ساتھ میرے خط بھی مٹی میں دبا دینا
اگر آنکھیں چرا کے میرے مدفن سے گزرنا ہو
تو ظالم صرف دو آنسو خوشی کے ہی بہا دینا

اس ''وصیت نامے'' کو صرف انتہائی احمقانہ اور قطعی ناقابلِ عمل ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تدفین کے وقت جب سوگوارانِ میت کو قبر میں اتار رہے ہوں تو وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا اور زار و قطار روتا ہوا نمودار ہو اور چلا کے کہے کہ ٹھہرو، یہ ایک کلو محبت نامے بھی ساتھ ہی دفنانے ہیں جو مرحومہ نے میرے نام تحریر کیے تھے۔ بیک وقت نظریں چرا کے گزرنا اور قبر پر دو آنسو ٹپکانے کا تصور بھی اتنا ہی بے تکا تھا۔

نسرین کو سخت شکایت تھی کہ جواب میں ندیم نے صرف ایک بار اسے خط لکھا تھا کہ ''عزیزہ من، سلامت باشد۔ بعد سلامِ عاشقانہ کے عرض ہے کہ مکتوبِ محبت موصول ہو کے باعثِ مسرت و شادمانی ہوا۔ لبوں سے چوم کے آنکھوں سے لگایا اور ازبر کر لیا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ تادمِ تحریر میں یہاں بفضلِ خدا خیر و عافیت کے ساتھ ہوں اور تمہارے لیے دعا گو ہوں کہ خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ فقط والسلام۔ خیر اندیش ندیم امجد درانی ولد وسیم امجد درانی (مرحوم) بقلم خود۔''

ظاہر ہے، اس پر نسرین سخت جز بز اور دلبرداشتہ ہوئی تھی مگر وہ شرمندگی اور احمقانہ انکساری کے سارے جذبات چہرے پر طاری کر کے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ خط لکھنے کے معاملے میں وہ طفلِ مکتب سے بھی زیادہ کورا ہے اور اس سے زیادہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ نسرین نے اسے بڑے مفید مشورے دیے۔ یہ بتایا کہ عاشقانہ جذبات سے سنسناتا ہوا محبت نامہ لکھنے کے لیے اسے کن رسائل و کتب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنا چاہیے اور مشق جاری رکھنی چاہیے۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا لیکن اس کے بعد موصول ہونے والے خط کے جواب میں ندیم نے اپنے پہلے خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ارسال کر کے پھر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نئے الفاظ کے ساتھ نیا مضمون لکھنا اس کے بس کی بات ہی نہیں۔ نسرین ایک مہینے اس سے روٹھی رہی لیکن اس کے بعد محبت کی ڈاک یک طرفہ ہوگئی۔ ندیم نے سکون کا سانس لیا اور محبت کو مال گاڑی کی طرح چلاتا رہا جب کہ نسرین کی خواہش یہ تھی کہ اسے وہ نان اسٹاپ ایکسپریس کی طرح دوڑا کے سیدھا عقدِ مسنونہ کے اسٹیشن پر پہنچا دے۔

''اڈا آ گیا جناب!'' ڈرائیور نے سواری کی رونی صورت اور غیر حاضر دماغی توازن کو تازہ واردات سے منسوب کیا اور لہجہ ہمدردانہ رکھا۔ ندیم چونکا اور سامان اتار کے نیچے رکھا۔ ٹیکسی کو رخصت کرنے کے بعد اس نے اڈے کی بے سر و سامانی اور خانہ ویرانی پر غور کیا۔ اڈے پر کوئی بس نہیں تھی اور خود اس کے سوا کوئی مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک استاد ٹائپ شخص برآمدے میں چارپائی پر توند کا غبارہ پھلائے چت پڑا تھا اور دو ''چھوٹے'' اس کے ٹھینسے جیسے پیر دبانے میں مصروف تھے۔ اس کے سرہانے کی طرف لکڑی کی میز کرسی خالی پڑی تھی اور بکنگ آفس والی کھڑکی میں سے اندر لاش کی طرح سر تک چادر اوڑھ کے سونے والے کو دیکھا جا سکتا تھا۔

شک تو ندیم کو پہلے بھی تھا کہ نو بجے کا وقت دینا ایک رسمی کارروائی ہے ورنہ تاندلیانوالہ براستہ ساجن پور جانے والی بس اس وقت تک روانہ نہیں ہوگی جب تک کہ اس کے اندر دیہاتی مسافر کوٹ کوٹ کے نہ بھر دیے جائیں۔ چھت پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہے اور انجن کے سوا مسافر کو کہیں نہ ٹھونسا جا سکتا ہو۔ اس میں اگر دوپہر بھی ہو جائے تو کچھ بعید نہیں۔ غالباً تجربہ کار مسافر یہ بات جانتے تھے چنانچہ وہ پونے نو بجے گھروں میں ناشتا کر کے ڈکاریں لے رہے تھے یا اسبابِ سفر سمیٹ کے الوداعی تقریبات میں مصروف تھے۔

ندیم نے سامان برآمدے میں رکھ کے کہا ''استاد جی! بس کب آئے گی۔''

استاد نے سوال کی نوعیت پر غور کیا ''کہاں سے؟ تاندلیانوالہ سے؟''

ندیم نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں جی! تاندلیانوالہ جانے والی۔''

دونوں چھوٹے دانت نکالنے لگے ''وہ تو چلی گئی۔''

''آپ لیٹ ہوگئے ہو۔''

ندیم نے برہمی سے اپنی گھڑی دکھائی ''مگر ابھی تو پونے نو بجے ہیں۔ بس کا ٹائم نو بجے روانگی کا تھا۔''

استاد نے مگرمچھ کی طرح کروٹ لی ''وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر بس بھر گئی، ساڑھے آٹھ بجے تک تو ہم کیا اسے نو بجے تک بلاوجہ روکے رکھتے'' آپ کے انتظار میں۔ مسافروں سے کہتے کہ شور مت کرو، بس اپنے ٹائم پر نو بجے ہی چلے گی۔''

جھنجلاہٹ اور غصے کے باوجود اب احتجاج کرنا اور شور مچانا اتنا ہی لاحاصل تھا جتنا بزور بازو برطرف کیے جانے والے وزیراعظم کا حق و انصاف کے لیے عدالت میں جانا۔ جو ہونا تھا، ہو چکا تھا اور اب یاد رکھنے کے قابل صرف ایک بات تھی کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وہ کچھ دیر بے وقوفوں کی طرح کھڑا یہ سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کرسی خالی تھی مگر استاد نے ایک بار بھی اسے تشریف رکھنے کے لیے نہ کہا اور تشریف رکھنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ اسے اب اپنا اسباب اٹھا کے کہیں نہ کہیں جانا تھا کیونکہ چوبیس گھنٹے بعد ملنے والی بس کے سوا ساجن پور پہنچنے کا کوئی متبادل ذریعہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں ایک مختصر سی فہرست ان ٹھکانوں کی مرتب کی جہاں جہاں اس کے لیے آسانی سے یا مجبوراً ایک دن اور رات گزارنا ممکن تھا۔ اس کے دوست تھے مگر اس وقت گھر پر کون ملے گا؟ سب اپنے اپنے دفتر کاروبار کے لیے نکل چکے ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے لکشمی چوک تک پھیلے ہوئے درجنوں ہوٹلوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جا سکتا تھا۔ اس میں چار پانچ سو روپے تو ضرور خرچ ہوں گے مگر پریشانی کوئی نہیں ہوگی۔

اسے ڈاکٹر امجد کا خیال بھی آیا۔ کیا وہ بس سے نکل گیا

ہوگا؟ نہیں' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نو بجے جانے والی بس کے لیے وہ آٹھ بجے لاری اڈے پر پہنچ گیا ہو۔ وہ اڈے پر موجود بھی نہیں تھا جس کے دو ہی مطلب لیے جاسکتے تھے یا تو وہ ابھی پہنچا نہیں یا بس نکل جانے کی اطلاع پاتے ہی ایک منٹ ضائع کیے بغیر خوش خوش اسی کار میں واپس لوٹ گیا ہوگا جسے اس کی پری جمال بیوی چلا کے لائی ہوگی۔ اپنے ہر انداز سے اور ہر جسمانی زاویے سے وہ ہیجان انگیز حد تک حسین تھی اور اسے ڈاکٹر امجد کے ساتھ دیکھ کے اگر وہ رشک اور حسد میں مبتلا ہو جاتا تھا تو یہ ایک فطری سی بات تھی۔ اسے ڈاکٹر امجد یاد آیا تو پھر بہت کچھ یاد آتا چلا گیا۔

ایک دن ڈاکٹر امجد کا اخبار میں شائع ہونے والا اشتہار اس کی نظر سے گزرا اور وہ بھی انٹرویو دینے پہنچ گیا۔ اسے ایک خوشگوار حیرت ہوئی جب اسے اپنے سوا کوئی بھی امیدوار نظر نہ آیا اور کسی دفتر کے برآمدے یا ہال کے بجائے اسے ایک شاندار کوٹھی کے سجے سجائے پُرتکلف ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔

پہلے ڈاکٹر امجد آیا.... پھر چائے آگئی۔ ڈاکٹر امجد نوجوان اور اسمارٹ آدمی تھا اور دلچسپ باتیں کرتا تھا۔ امارت اس کے رہن سہن کے انداز سے ہی نہیں چہرے مہرے اور انداز و اطوار سے بھی عیاں تھی۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

''تمہارا نام تو ہے امجد ندیم سید۔ معروف ڈراما نویس اصغر ندیم سید سے تمہارا کوئی تعلق ہے؟''

''ہوتا تو شاید بہت پہلے ان کی سفارش سے میں ٹی وی کا پروڈیوسر بن چکا ہوتا۔''

ڈاکٹر امجد ہنسنے لگا ''جیسا کہ تم جانتے ہو۔ نام تو میرا بھی امجد محمود ہے مگر مجھے کوئی محمود نہیں کہتا۔ تمہیں ندیم کیوں کہتے ہیں؟ امجد کیوں نہیں کہتے؟''

''نام میرے باپ نے رکھا تھا مگر ماں کو ندیم اچھا لگتا تھا۔ اسے فلم اسٹار ندیم بہت پسند تھا اور یہ غلط فہمی بھی ہوگئی تھی بعد میں کہ میری صورت ندیم سے ملتی ہے۔''

''اس میں غلط فہمی کی کوئی بات نہیں'' ڈاکٹر امجد نے اس کی صورت پر غور کر کے کہا ''تمہارے چہرے کے نقوش میں ندیم کی جھلک ہے۔''

''اصل فرق تو اس کے اور میرے نصیب کا ہے ڈاکٹر صاحب!''

امجد ہنسنے لگا ''جانتے ہو' میں نے صرف تمہیں انٹرویو کے لیے کیوں بلایا ہے؟ اس لیے کہ تمہارا نام بھی امجد تھا۔ اتفاق سے موصول ہونے والی ایک سو بیس درخواستوں میں کسی دوسرے امجد نے اپلائی نہیں کیا تھا چنانچہ تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے مقابلے پر کوئی بھی نہیں۔''

ندیم کا منہ کھلا رہ گیا ''آپ کا مطلب ہے' مجھے یہ ملازمت مل گئی ہے؟''

''اس کا انحصار اب تم پر ہے کہ تم یہ ملازمت قبول کرتے ہو یا نہیں۔ اپنی کوالی فیکیشن تو تم نے درخواست میں لکھ ہی دی تھی' یہ ایم اے پولیٹیکل سائنس کیوں کیا تھا تم نے؟''

''بس جناب! غلطی ہوگئی' آئندہ نہیں کروں گا۔''

ڈاکٹر امجد ہنس پڑا ''تم شادی شدہ ہو؟''

''یہ غلطی ابھی تک نہیں کی۔''

''ماں باپ' بھائی بہن؟''

ندیم نے نفی میں سر ہلایا ''ایک بہن کے سوا سب حادثے میں مر گئے۔ بہن سعودی عرب میں ہے۔''

''گویا یہاں کوئی ذمے داری نہیں تم پر۔ ویری گُڈ!''

ندیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں ویری گڈ والی کون سی بات ہے مگر وہ خاموش رہا۔

''میرے خیال میں تو تم پرفیکٹ آدمی ہو اس جاب کے لیے۔ تم ساجن پور جا سکتے ہو اور وہاں رہ سکتے ہو؟''

''ساجن پور! یہ کہاں ہے؟''

''بس سے جائیں تو دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ وہاں گورنمنٹ کا ایک بی ایچ یو ہے۔ بیسک ہیلتھ یونٹ۔ عام الفاظ میں سرکاری ڈسپنسری۔ تم نے کبھی کسی دیہات قصبے کا سرکاری اسپتال دیکھا ہے؟''

''میں نے دیہات قصبہ ہی نہیں دیکھا۔''

''ان کے بارے میں سنا تو ہوگا۔ سمجھ لو وہ اس سے بھی زیادہ ہی بیہودہ جگہ ہوتی ہے جسے سرکار بی ایچ یو کہتی ہے' وہ عام طور پر ایک یا زیادہ سے زیادہ دو کمرے ہوتے ہیں۔ کھڑکی دروازے بھی ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان میں شیشے بھی ہوں۔ ساجن پور میں بجلی ہے جو سب سے اچھی بات ہے۔ تم بلب' پنکھا یا ٹی وی وغیرہ ساتھ لے جاسکتے ہو۔ ایک کمرے میں تمہاری رہائش ہوگی۔ دوسرے میں ڈسپنسری۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس میں ایک میز کرسی ضرور ہوگی اور شاید ایک الماری بھی۔ امراض وہاں وہی ہوتے ہیں جو شہر میں۔ ملیریا' ٹی بی' ٹائیفائیڈ' فلو اور پیچش وغیرہ۔ لیکن گندے پانی' گندے ماحول' گائے بھینسوں کے ساتھ انسانوں کے رہنے اور جہالت کے باعث وہاں دیگر بیماریوں کا اوسط بھی بہت زیادہ ہے۔ تمہیں مریضوں کی کمی نہیں ہوگی۔''

''مجھے.....؟''

ڈاکٹر امجد نے اپنے لیے ایک پیالی چائے اور بنائی ''بدقسمتی سے میری پوسٹنگ وہاں ہوگئی ہے اور صورت حالات کچھ ایسی ہے کہ مجھے مجبوراً جوائن تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ اس میں ایک سال تو لگ ہی جائے گا۔ اسکالرشپ کے لیے ایک سال تک کسی دیہی علاقے میں پریکٹس کا تجربہ ضروری ہے۔ شرط پوری کرنے کے لیے یہ ایک سال مجھے وہاں لگانا پڑے گا۔ اس کے لیے مجھے ساڑھے چھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملے گی۔ جیسا کہ تم میرے لائف اسٹائل سے اندازہ کر سکتے ہو' مجھے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ ساڑھے چھ ہزار تو میری گاڑی کے پیٹرول کا خرچ ہوگا۔ شاید اس سے زیادہ میری بیوی ہر مہینے اپنے میک اپ کے سامان پر اڑا دیتی ہوگی۔ چنانچہ میری تنخواہ تم لے سکتے ہو۔''

ندیم بھونچکا رہ گیا ''میں کیسے لے سکتا ہوں۔''

''پہلے میری پوری بات سن لو۔ مجھے ڈھائی ہزار ماہانہ کا ایک اسسٹنٹ بھی دیا گیا ہے' جو ویسے تو ڈسپنسر کہلاتا ہے مگر درحقیقت سب کچھ ہوتا ہے۔ چوکیدار' سویپر' خانساماں' یونٹ میں جتنے کام ہوں' مریض دیکھنے کے علاوہ' سب اسے کرنے ہوتے ہیں۔ یہ رقم ملا کے تمہیں مل جائیں گے نو ہزار۔''

ندیم کا دماغ چکرا گیا ''ڈاکٹر صاحب! میں کچھ سمجھا نہیں۔''

ڈاکٹر امجد نے اسے ڈانٹا ''میں کیا فارسی بول رہا ہوں۔ پوری بات پوری سنو گے تو سمجھو گے۔ بیچ بیچ میں مت بولو۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ شہر کے کسی چھوٹے موٹے اسپتال میں پوسٹنگ ہو جائے مگر میں سفارشوں کے مقابلے میں مات کھا گیا۔ ایک بار سیکریٹری ہیلتھ کی سفارش تھی مگر دوسرا بندہ وزیر صحت کی سفارش لے آیا تھا۔ دوسری بار میں نے ایک وزیر سے فون کرایا مگر مقابلے پر گورنر کا فون آ گیا۔ اب میرا یہاں اچھا بھلا کلینک چل رہا ہے۔ میری بیوی بھی ڈاکٹر ہے۔ میرے ساتھ بیٹھتی ہے۔ میں ساجن پور کیسے جاؤں؟ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ میری بیوی ذاتی خرچ پر جائے گی اور گائنی میں اسپیشلائز کرے گی۔ میں گورنمنٹ اسکالرشپ پر جاؤں گا نیورولوجی میں اسپیلائز کروں گا لیکن ہم لوٹ کے نہیں آئیں گے۔ ہم وہیں برطانیہ میں سیٹل ہو جائیں گے۔ بیچ میں آگئی ہے یہ دیہی علاقے میں پریکٹس کی شرط تو میں نے سوچا کہ جیسے تیسے یہ ایک سال گزار دیا جائے' میں اور تم ایک ساتھ ساجن پور چلیں گے۔ چارج لینے کے لیے میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ ایک دن میں' میں تمہیں سارا کام سمجھا دوں گا اور واپس آ جاؤں گا۔ پھر تم وہاں کام کرتے رہو گے میری جگہ۔''

ندیم پھر بھونچکا رہ گیا ''ڈاکٹر امجد بن کے؟''

''EXACTLY''

''لیکن سر.....! یہ جعلسازی ہوگی' میں پکڑا جاؤں گا۔''

ڈاکٹر امجد کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا ''وہ کیسے؟ جب گرد و نواح میں دس کوس کے لوگ تمہیں ڈاکٹر امجد تسلیم کریں گے' سیدھے سادے دیہاتی' وہ کیا جانیں شک کرنا۔''

''لیکن سر! دوسرے لوگ محکمۂ صحت کے اعلیٰ حکام؟''

ڈاکٹر امجد نے ایک قہقہہ مارا ''اعلیٰ حکام ......ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ' سیکریٹری وزارت صحت یا حاضر سروس وزیر صحت؟ یار! تم واقعی بھولے بادشاہ ہو' وہاں نہ مری' سوات جیسے نظارے ہیں۔ نہ شکار ہے' نہ دریا جھیل جہاں مچھلی ملتی ہو' حد تو یہ ہے کہ کوئی ڈاک بنگلا تک نہیں جہاں وہ کسی کے ساتھ ایک رات گزار سکیں اور داد عیش دے سکیں۔ کیا کرے گا محکمۂ صحت کا کوئی افسر ایسی جگہ جا کے؟ ہاں ایک وجہ اور ہو سکتی تھی۔ محکمۂ زراعت والے نہروں والے' وہ کیا ہوتا ہے' آبیانہ مالیانہ وغیرہ' وہ وصول کرنے کے ذمے دار سرکاری اہلکار سال کے سال اپنا نذرانہ وصول کرنے جاتے ہیں مگر ایک ہیلتھ یونٹ تو صحرا میں اگا ہوا بے ثمر کانٹے دار جھاڑ ہے۔ اس سے کسی کو کیا فیض پہنچ سکتا ہے۔ ایک دیہی ہیلتھ یونٹ کا سالانہ بجٹ معلوم ہے' کتنا ہوتا ہے؟''

ندیم نے لاعلمی کا اعتراف کرنے کے لیے گھوڑے جیسا سر ہلا دیا۔

''اس رقم سے اگر تم سال بھر مریضوں کو پچاس روپے کی ہزار ملنے والی اسپرین کی گولیاں' کھانسی کا لال شربت یا دستوں کی بیماری میں' جو وہاں بہت عام ہوتی ہے ''او آر ایس'' بھی دینا چاہو تو تمہارا بجٹ شاید چھ مہینے میں خلاص ہو جائے گا۔ باقی چھ مہینے تم کیا کرو گے؟ مریضوں کو تسلی دو گے یا تعویذ؟ ہر بیماری سے شفا عطا کرنے والا تعویذ گنڈے کا میڈیکل اسپیشلسٹ بھی وہاں کوئی مولوی یا صاحب کرامت سمجھا جانے والا مقامی پیر ہوتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تم تو بس وہاں جا کے مزے سے بیٹھ جاؤ۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ سالانہ معائنے کے نام پر محکمۂ صحت کا کوئی ہیڈ کلرک ٹائپ شخص سال میں ایک بار دو گھنٹے کے لیے آتا ہے اور رجسٹروں وغیرہ پر مہر کے ساتھ اپنے دستخط کر کے بھاگ لیتا ہے۔ وہ تمہیں [illegible]

ڈاکٹر امجد ہے۔ جو ڈسپنسری میں مل جائے وہی ڈاکٹر امجد۔ کوئی فرض شناس بننے کی کوشش میں گاؤں والوں سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے تو سو فیصد لوگ تمہارے حق میں گواہی دیں گے کہ تم ہی ڈاکٹر امجد ہو۔ مگر اس کا کوئی چانس نہیں' ایسا آج تک کہیں نہیں ہوا۔''

ندیم منمنایا ''یہ سب تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! مگر......''

''کیا مگر؟''

''یہ...... جعلسازی تو ہے۔''

ڈاکٹر برہم ہوگیا ''دیکھو۔ قدرت نے تمہیں ایک گولڈن چانس فراہم کیا ہے۔ اس لیے فضول باتیں مت سوچو۔ احمقانہ باتیں مت کرو۔ یار' جعلسازی کہاں نہیں ہو رہی ہے اور کون نہیں کر رہا ہے۔ وہاں جو دوائیں تمہیں ملیں گی وہ بھی جعلی ہوں گی۔ خود محکمے والے فراہم کریں گے۔ گاؤں دیہات کے سرکاری اسکول اور ڈسپنسریاں، دونوں کا حال ایک جیسا ہے۔ سیکڑوں اسکول اور سیکڑوں ڈسپنسریاں صرف کاغذوں پر موجود ہیں۔ کاغذات میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ وہاں عملہ بھی ہے اور دوائیں بھی دستیاب ہیں۔ محکمہ صحت کے سالانہ بجٹ میں کروڑوں روپے کا غبن ایسے ہی ہوتا ہے۔ گھوسٹ اسکولوں کی تعداد ہزاروں میں ہے جہاں تالے پڑے رہتے ہیں سارا سال مگر دکھایا یہ جاتا ہے کہ وہاں طلبہ بھی ہیں اور اساتذہ بھی۔ ان کی تنخواہیں اور اسکول کی دیکھ بھال کا سارا خرچ بابو اور افسر مل کے بانٹ لیتے ہیں۔ کیا یہ سب تم نے اخبار میں نہیں پڑھا۔ کوئی نیا وزیر تعلیم آئے تو یہ بیان وہ ضرور دیتا ہے کہ تعلیم کے ہر شعبے میں اب انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں گی اور گھوسٹ اسکولوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ سال میں ایک بار سیکریٹری محکمہ صحت بھی یہ بیان چھپواتا ہے۔''

ندیم نے شرمندگی کے ساتھ اعتراف کیا ''میں اخبار نہیں پڑھتا۔''

''بہت اچھا کرتے ہو۔'' ڈاکٹر امجد نے کہا'' جہالت فی زمانہ بڑی نعمت ہے۔ آدمی خوش رہتا ہے۔ اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ خواہ مخواہ دوسروں کے لیے فرسٹریشن میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اب تم ذرا ٹھنڈے دماغ کے ساتھ میری پیشکش پر غور فرماؤ۔ نو ہزار نقد تو میں تمہیں ویسے ہی پیش کر رہا ہوں ماہانہ۔ یہ گریڈ اٹھارہ کے ایک افسر کی تنخواہ ہے۔ اس رقم سے تم شہر میں بھی آرام سے رہ سکتے ہو۔ ساجن پور میں تو تمہارا کوئی خرچ ہی نہیں۔ رہائش فری' بجلی فری' دودھ' دہی انڈے' مرغی سب فری۔ ہوسکتا ہے تمہارے دستِ شفا سے نئی زندگی پانے والا سال کے سال گندم' چاول کی بوری بھی پہنچا دے۔ ان لوگوں کی ایک اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ ٹھیک ہوجائیں تو اسے ڈاکٹر کا کمال سمجھتے ہیں اور فوت ہوجائیں تو اسے اللہ کی رضا۔ وہ ڈاکٹر کو کبھی الزام نہیں دیتے۔ یعنی وہاں ڈاکٹر کو صرف گڈ ول ملتی ہے اور وہ عزت جو شہروں میں ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کو بھی نہیں ملتی۔ سنڈے کو ڈسپنسری بند ہوگی۔ چاہو تو ہفتے کی دوپہر کے بعد بس پکڑو اور شہر آجاؤ۔ دو دن عیش سے گزارو اور پیر کو صبح والی بس سے لوٹ جاؤ۔ عام طور پر ڈسپنسری کا ٹائم ہوتا ہے نو بجے سے ایک دو بجے تک لیکن ٹائم کے معاملے میں تم خود مختار ہو۔ کسی دن ڈسپنسری نہیں کھولو گے تب بھی فرق نہیں پڑے گا۔ وہاں کوئی فون نہیں ہے کہ کوئی تمہاری حاضری چیک کرسکے۔ احتیاطاً میں تمہیں موبائل فون دے دوں گا تاکہ تم سے رابطہ رہے اور تمہاری خیر خبر بھی لیتا رہوں گا۔ کوشش کروں گا کہ ہفتے میں نہ سہی' مہینے میں ایک بار گاؤں کا چکر بھی لگا لوں مگر وعدہ نہیں کرتا۔ میری تنخواہ تو یہاں جائے گی میرے بینک اکاؤنٹ میں۔ تمہاری تنخواہ کی رقم کا واؤچر میں تم سے ہر ماہ سائن کراؤں گا۔ اس کے بعد ہماری تمہاری سرکاری ذمے داری ختم۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب! اگر میرے غلط علاج سے کوئی بندہ مر گیا؟'' ندیم کا دماغ سخت الجھن کا شکار تھا۔

''یار' کیوں مرے گا کوئی بندہ۔ گنتی کی دس بارہ عام بیماریاں ہوں گی جن کے لیے تم دوا دو گے۔ نزلہ' زکام کی کھانسی' بخار مثلاً ملیریا اور ٹائی فائیڈ' آنکھوں یا جلد کی انفکشن جو گندگی سے ہوتی ہے۔ پیٹ کی خرابی' یرقان جو خود بخود ٹھیک ہوجاتا ہے۔ بلڈ پریشر اور شوگر۔ ان کی گنی چنی مخصوص دوائیں ہیں جو مختلف ناموں سے ملتی ہیں۔ گولیاں بھی اور شربت بھی۔ وہ میں تمہیں بتادوں گا۔ ان سے آج تک کوئی فوت نہیں ہوا۔ تم خود ڈسپنسر اور میڈیکل ٹیکنالوجسٹ ہو۔ کافی چیزیں سمجھتے ہو۔ وہاں تو تم زیادہ تر اپنی عقل سے تشخیص کرو گے۔ کسی کا مرض سمجھ میں نہ آئے تو اسے ٹیسٹ کرانے کے لیے شہر بھیج دو۔ بھینس ٹکر مار کے کسی کی پسلیاں توڑ دے۔ اسے میو اسپتال روانہ کرنے کے سوا تم کیا کرسکتے ہو؟ سنگین مسائل کا تمہارے پاس کوئی حل نہیں ہوگا۔ کینسر تو دور کی بات ہے' دل کے دورے' گردوں کا خرابی یہاں تک کہ ٹی بی کا علاج کرانے کے لیے تمہیں مریضوں کو شہر کے بڑے اسپتال بھیجنا پڑے گا۔ دوا ساز کمپنیوں کے نمائندے تو وہاں آتے نہیں' تمہیں خود ہی ان کی کیٹلاگ وغیرہ دیکھنی پڑیں گی۔''

''وہ دیکھی ہیں میں نے' میرے پاس ہیں۔''

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں' انشاء اللہ تم ایک کامیاب ڈاکٹر ...گے' جس کے ہاتھ میں شفا ہوگی۔ اب ایک بزرگانہ نصیحت ...ی سن لو۔ گاؤں کی رہنے والی شرم و حیا کی پتلیاں مخصوص ...انہ امراض اور حمل کے مسائل لے کر تو تمہارے پاس آئیں ...گی۔ لیکن دیگر بیماریوں میں وہ زیادہ مبتلا ہوتی ہیں کیونکہ ...ن کے حصے کا زیادہ کھانا مرد کھا جاتے ہیں اور وہ کام بھی زیادہ ...رتی ہیں۔ بچے بھی زیادہ جنتی ہیں اور ظلم بھی زیادہ سہتی ہیں۔ ...وئی تمہارے من کو بھا جائے یا تمہیں اپنے دامِ حسن میں ...رفتار کرنے کی کوشش کرے تو سات بار لاحول پڑھ کے اس ...سے دور بھاگ جانا۔ کھیتوں کھلیانوں میں ریشمی لاچے پہن ...کے ناچنے گانے والی مٹیاریں صرف فلموں میں ہوتی ہیں۔ ...یہاں کسی سے دل لگی میں دل لگایا تو اس کے دو انجام ہوں ...گے۔ یا تو وہ تمہارے پلے باندھ دی جائے گی یا اس کا کوئی ...غیرت مند باپ اور بھائی تمہیں شہید عشق کے مرتبے پر فائز ...کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ دل لگانے کے لیے اپنے شہر کی ...لڑکیاں ہی ٹھیک ہیں۔ ایک نوجوان اور ہینڈسم ڈاکٹر کی حیثیت ...سے تمہیں اس کے مواقع بہت ملیں گے۔ عشق کرنے کے بھی ...اور مقتول ہونے کے بھی اس لیے میں تمہیں خبردار کر رہا ...ہوں۔''

ندیم ہنسنے لگا ''آپ فکر نہ کریں۔ میں جاتے ہی اعلان ...کروں گا کہ گاؤں کی سب بزرگ خواتین میری مائیں اور ...سب جوان عورتیں میری حقیقی بہنیں ہیں۔''

''اب ہم آتے ہیں تمہارے روشن مستقبل کی طرف۔ تم ...چاہو تو وہیں تاندلیانوالہ میں ڈاکٹر امجد بن کے اپنا کلینک ...کھول سکتے ہو۔ تمہاری شام فارغ ہوگی' دن میں قیلولہ فرماؤ۔ ...ضروری دوائیں شہر سے خرید لے جاؤ۔ میرے پاس ...میڈیکل ریپ جو فری سیمپل چھوڑ جاتے ہیں' وہ میں جمع کر کے ...رکھوں گا اور ہر ہفتے .... تمہیں دے دوں گا۔ میں شرط لگا سکتا ...ہوں کہ فری ڈسپنسری سے زیادہ تمہاری شام کی پریکٹس چلے ...گی۔ یعنی وٹامن کی اور درد کی سستی ترین گولیاں دو' بی ...ٹک ...لیکس کے انجکشن لگاؤ' مکسچر پلاؤ اور ایک کے پانچ وصول ...کرو یا دس۔ ٹیسٹ تو لوگ شہر سے کرائیں گے مگر ساری ...رپورٹیں تم دیکھ سکتے ہو۔ اگر ہمت سے کام لے کر دو چار سال ...ساجن پور میں گزار دو تو عزت' شہرت' دولت سب حاصل ...کرسکتے ہو۔ علاقے کے سب سے مستند اور کامیاب ڈاکٹر بن ...سکتے ہو۔ سال بھر بعد جب میں ولایت چلا جاؤں گا تو تم ...سرکاری ڈسپنسری میں تالا ڈالو اور صبح شام اپنی پریکٹس کرو۔ ...انشاء اللہ بہت جلد وہ وقت آئے گا جب تم اپنی گاڑی خرید لو گے اور بس کے بجائے اپنی کار میں شہر آیا جایا کرو گے۔ بس دو گھنٹے لیتی ہے' اپنی کار میں ایک گھنٹا لگے گا۔ چاہو تو روز آؤ جاؤ۔ ٹھاٹ سے شہر میں رہو۔ کوشش کرو تو کسی خوبصورت سی نرس سے شادی کرلو۔ وہ گاؤں میں ماہر امراض نسواں بن کے تمہاری مدد کرسکتی ہے۔ تم دونوں مل کے اپنا اسپتال چلا سکتے ہو۔''

ڈاکٹر امجد خواب دکھانے کا ماہر تھا۔ اس نے پہلے نو ہزار ماہانہ کی آفر سے اور پھر ڈاکٹر بننے کے روشن امکانات پر تقریر کر کے ندیم کو ہپناٹائز کردیا۔ وہ رات بھر جاگتا رہا اور حساب لگاتا رہا۔ دس ہزار ماہانہ تو وہ بینک سے نکلوا سکتا ہے۔ سال بھر تک نو ہزار ماہانہ ڈاکٹر امجد کا وظیفہ۔ یہ ہوئے انیس ہزار۔ سال کے دو لاکھ اٹھائیس ہزار۔ گاؤں میں رہنے کا خرچہ کوئی نہیں۔ شہر میں اللہ سلامت رکھے خالہ کو۔ اس کے باوجود فرض کرو وہ دو ڈھائی ہزار ماہانہ عیاشی میں اڑا دے تب بھی سال بھر بعد بچے دو لاکھ۔ اس کے بعد اپنی پریکٹس ہے۔ اگر وہ سچ مچ ایک سال میں ڈاکٹر امجد ندیم ہوگیا تو بس وارے نیارے۔ شہر میں کوٹھی' کوٹھی میں کار اور کار میں ڈاکٹر امجد کی بیوی جیسی کوئی ایسی حسینہ عالم جسے دیکھ کے آدمی پلک جھپکانا تو کیا سانس لینا بھی بھول جائے۔

خوابوں نے بالآخر ندیم کے سارے اندیشوں اور وسوسوں کو شکست فاش دی اور اس نے ڈاکٹر امجد کو مطلع کردیا کہ وہ ساجن پور مشن پر روانگی کے لیے بالکل تیار ہے۔ ڈاکٹر امجد کو اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے جال ہی ایسا پھیلایا تھا۔ ترغیب اگر اصل سے آدھی ہوتی تب بھی ندیم آتا۔ اس کی خودی' ایمانداری اور اصول پرستی وغیرہ کا گراف زیرو سے اتنا نیچے تھا کہ ڈاکٹر امجد کے بجائے ڈاکوؤں کے کسی گروہ کا سردار اسے ڈکیتی کے اخلاقی اور معاشرتی فوائد پر لیکچر دیتا تو وہ اس کے گروہ میں بھی برضا و رغبت شامل ہوجاتا۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک ٹیکسی اس کے سامنے آکے رکی اور اس میں سے ڈاکٹر امجد ایک بریف کیس اٹھائے نمودار ہوا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کی گھڑی میں نو بج کے پانچ منٹ ہو چکے تھے اور بس کمپنی والے سختی سے وقت کی پابندی کرتے تب بھی ڈاکٹر امجد کو وہ بس نہ ملتی جو آدھا گھنٹا پہلے ہی روانہ ہوگئی تھی۔

''میں تو پریشان تھا کہ لیٹ ہوگیا'' ڈاکٹر امجد نے خوش دلی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا'' تم بھی ابھی آئے ہو؟''

''جی نہیں' میں پونے نو بجے پہنچا تھا تب بھی لیٹ تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''بس ساڑھے آٹھ بجے ہی جا چکی تھی۔''

ڈاکٹر امجد نے بے یقینی سے اِدھر اُدھر دیکھا ''یہ کیسے ہوسکتا ہے یار!''

''ایسا ہوچکا ہے ڈاکٹر صاحب! ساجن پور جانے والی بس کا دستور یہ ہے کہ جب وہ بھر جاتی ہے تو چلی جاتی ہے۔ آج ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے ہی بھر گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کل دوپہر تک بھی نہ بھرے۔''

''اچھا' یہ سسٹم ہے'' ڈاکٹر امجد نے کہا ''پھر اب تم کیا کرو گے۔ کل صبح کی بس پکڑنے کے لیے یہاں ایسے ہی کھڑے رہو گے یا پڑے رہو گے؟''

''آپ کیا کریں گے؟'' ندیم نے کہا۔

''میں فوراً واپس جا کے بیوی کو بے وقوف بناؤں گا۔ اس سے جھوٹ بولوں گا کہ تمہاری وجہ سے میں آدھے راستے سے لوٹ آیا'' ڈاکٹر امجد ہنسا ''دراصل وہ ضد کررہی تھی کہ میں آج نہ جاؤں۔ اس نے رات خواب میں دیکھا کہ جس بس سے میں ساجن پور جارہا ہوں' وہ راستے میں الٹ گئی۔ میں نے کہا کہ پھر تو میرا اسی بس سے جانا بے حد ضروری ہے۔ بس الٹنے سے لوگ زخمی ہوں گے تو ایک ڈاکٹر ہی سب سے زیادہ کام آئے گا۔ وہ خفا ہوگئی۔''

''آپ کو تو موقع مل گیا اسے منانے کا۔''

''ہاں یار! اب میں واپس جا کے کہوں گا کہ راستے میں میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی اور دل نے مجبور کیا تو میں واپس آگیا۔ اچھا' اگر اللہ کو منظور ہوا تو کل انگریزی کا سفر کریں گے۔''

''آج چارج نہ لینے سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟''

ڈاکٹر امجد نے قہقہے کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ مارا ''ڈاکٹر صاحب! کیسا چارج اور کہاں کا چارج۔ تین مہینے سے یونٹ بند پڑا ہے۔ ہم ہی جا کے اس کا تالا کھولیں گے بلکہ توڑیں گے کیونکہ چابی تو کوئی ہے نہیں' آج نہ سہی' کل۔ کل نہ سہی پرسوں۔ بس چارج رپورٹ آج کی تاریخ میں بھیج دیں گے۔ ایسے لمبا منہ کرکے اداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے' تمہاری بیوی بھاگ گئی ہے۔''

ڈاکٹر امجد زندہ دل اور خوش گوار آدمی تھا۔ جب وہ اسی ٹیکسی میں بیٹھ کے رخصت ہوگیا اور پاؤں دبوانے والے استاد نے بھی پرتمسخر نظروں سے سوال کرنا شروع کیا کہ تم کب دفع ہوگے تو ندیم نے ایک تانگے کو روک لیا۔ یہ زندگی میں ایک عجیب اتفاق تھا کہ وہ اسی شہر میں تھا جس میں اس کی ساری زندگی گزری تھی مگر آج اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ گھنٹا بھر تک تخ کرکے رینگتے تانگے میں کم سے کم دس ہوٹلوں کی خاک چھاننے کے بعد اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ شاید اس کی شکل ہی ایسی ہے کہ ہوٹل والے اسے دیکھتے ہی جواب دے دیتے ہیں کہ کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔ اونگھتا ہوا گھوڑا مشکل سے چند قدم چلتا تھا کہ اسے روک لیا جاتا تھا۔ ندیم کسی دوسرے ہوٹل میں قدم رنجہ فرماتا تھا اور اندر جانے سے پہلے پلٹ کر دیکھتا تھا کہ کہیں تانگے والا سامان لے کر رفوچکر تو نہیں ہوگیا اور پھر دل کو تسلی دیتا تھا کہ ایسے ممکن نہیں۔ گھوڑے سے دگنی رفتار سے تو وہ خود دوڑ سکتا تھا اور اگلے چوک سے پہلے پھر تانگے میں سوار ہوسکتا تھا۔

اچانک اسے ڈاکٹر امجد کا خیال آیا جس نے اپنی سو فیصد ذاتی بیوی کو خوش کرنے کے لیے بھی جھوٹ کا سہارا لینا ضروری سمجھا تھا۔ پھر نسرین کو خوش کرنے کے لیے یہی ڈراما وہ کیوں نہیں کرسکتا؟ سب عورتیں ایسے جھوٹ سے ہی خوش ہوتی ہیں۔

تانگا اگلے ہوٹل کے دروازے پر رک گیا تو ندیم نے کہا۔ ''خالہ کے گھر چلو۔''

تانگے والا دم بخود رہ گیا ''کس کی خالہ کے گھر؟''

ندیم نے اسے ڈانٹنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنی خالہ کے گھر کا پتا سمجھانے کے بعد تانگے کی مختصر ترچھی اور جھکی ہوئی سیٹ پر پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا۔ تانگے کے گھوڑے کی رفتار پاور بسبب ضعیفی و ناتوانی نصف رہ گئی تھی۔ چنانچہ چابک مارنے سے یا ایکسی لریٹر (جو دم کے قریب واقع تھا) دبانے سے بھی اس کی رفتار میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ خود تانگے کے جملہ اعضا حرکت کو بڑی آہ و فغاں کے ساتھ برداشت کررہے تھے۔ اس کے دونوں پہیوں کی گولائی میں فرق تھا یا ان پر چڑھا ہوا ربر کہیں سے کٹ گیا تھا کہ ہر پہیہ دائرے میں حرکت کرتے ہوئے ایک بار اچھلتا ضرور تھا۔

پون گھنٹے کے بعد ندیم نے سوٹ کیس اور بیگ کو دروازے کے سامنے اتار کے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ کے اسے بجانے کی کوشش کی اور فرطِ جذبات میں یہ بھول گیا کہ اس کا اوپر والا حصہ استدادِ زمانہ کی نذر ہوچکا ہے۔ حلق سے بلند آہنگ جیسی آواز نکالتے ہوئے اس نے ایک جھٹکا لیا اور پھر دروازے پر ہاتھ مارنے لگا۔

معمول کے مطابق خالہ کی پھٹے ڈھول جیسی آواز اندر سے صاف سنائی دینے لگی ''ہائے ہائے' کون کم بخت آگیا دروازہ توڑنے؟''

ندیم نے بنکار کے کہا ''تمہارا اکلوتا بھانجا!''

خالہ نے اس جواب کو منطقی بنیادوں پر مسترد کردیا۔ ''چل دفع ہو یہاں سے۔ وہ بے چارہ تو خوار ہورہا ہوگا ساجن پور میں۔ سچ بتا کون ہے تو۔''

''سچ پوچھتی ہو تو بتانا ہی پڑے گا۔ ہم ڈاکو ہیں؟'' ندیم نے کہا مگر اس وقت تک خالہ نے دروازے کی جھری میں سے اپنے بھانجے کی شبیہہ ملاحظہ کرلی تھی۔ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

''ندیم...... تو...... تو یہاں کیسے؟'' خالہ نے آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھا۔

ندیم اپنا سامان کھینچ کے اندر لے گیا۔ ''بس خالہ! میں نے اپنا فیصلہ منسوخ کردیا ہے۔''

خالہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ معلوم نہیں وہ کس فیصلے کی منسوخی کا اعلان کررہا تھا۔ ان کی ہمت نہ پڑی کہ وہ پوچھ سکیں کہ اس فیصلے کا تعلق اس کے ازدواجی مستقبل سے تو نہیں ہے۔

جوتوں کے نقش قالین پر چھوڑتے ہوئے ندیم صوفے تک گیا اور نیم دراز ہوگیا۔ ''میں نے ساجن پور جانے کا فیصلہ منسوخ کردیا ہے۔ اب میں یہیں رہوں گا۔''

خالہ کا منہ بوکھلاہٹ میں کھلا رہ گیا ''یہاں رہے گا...... مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ میں اپنا گھر بیچ کے سارا پیسا جوئے میں لوٹا چکا ہوں خالہ!'' ندیم نے بڑی مسرت سے اطلاع دی۔

''میرا مطلب تھا۔ آخر ساجن پور کیوں نہیں جارہا ہے تو؟ کیا کرے گا یہاں؟'' خالہ نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

دروازے کا پردہ ہلا اور چاند جیسے گول چھیتے اور تقریباً اتنے ہی داغ دار چہرے والی نسرین آنکھوں کے چھوٹے چھوٹے بلب خوشی سے چمکاتی اندر آگئی ''تم واقعی ساجن پور نہیں جارہے ہو۔''

''فی الحال تو ایسا کوئی ارادہ نہیں'' ندیم نے کہا۔

خالہ نے ایک سوال دہرایا ''لیکن...... لاہور میں رہ کے کیا کرے گا' کوئی اور کام مل گیا ہے کیا' یہاں نوکری لگ گئی ہے؟''

''نہیں...... لیکن مل جائے گی کبھی نہ کبھی'' اس نے ایک مصنوعی جماہی لی ''ابھی تو سوچا کہ ہے بس آرام کروں۔ جس کے پاس اتنا پیسا ہو اسے کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ آج لاکھوں ہیں میرے پاس بینک میں۔''

خالہ کی بدحواسی بڑھ گئی ''لیکن بیٹا! ایسے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ مرد کوئی بیکار بیٹھے اچھے لگتے ہیں گھر میں؟''

نسرین نے اس کی طرف داری میں بڑی مضبوط دلیل دی ''اماں' یہ بزنس کرسکتے ہیں لاہور میں۔''

''ہاں۔ تم سموسے بڑے اچھے بناتی ہو' روز تل دینا...... میں یہاں گلی کے نکڑ پر لے کے بیٹھ جاؤں گا۔ شام تک سو کا ایک نوٹ تو کھرا سمجھو خالہ! مجھے اپنی ضرورت کے لیے بہت ہے۔''

نسرین ہنسنے لگی لیکن خالہ کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں آئی۔ وہ اچانک متفکر ہوگئی تھیں ''یہ سب تو ٹھیک ہے بیٹی! تو بزنس کرسکتا ہے مگر تیرا یہاں رہنا......''

''ارے خالہ۔ تم سمجھ رہی ہو میں مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے آگیا ہوں۔ وہ تو تم ہی کہتی تھیں روز مجھ سے کہ یہ بھی تیرا ہی گھر ہے۔ میں تمہیں ہزار روپے تو دوں گا نقد کرائے کے۔ وہ جو اوپر خالو کا کمرا ہے نا' جس میں پرانی گلی سڑی کتابیں جمع کررکھی ہیں انہوں نے۔ وہ خالی کرادینا میرے لیے۔ ہزار میں دوں گا کھانے کے۔''

خالہ کا پارا چڑھ گیا ''ارے باؤلا ہوا ہے لڑکے۔ یہ بھی تو سوچ لوگ کیا کہیں گے۔''

''ایسی کی تیسی لوگوں کی۔ کوئی تم سے کچھ کہے تو مجھے بتانا۔ اس کی بتیسی تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ خالہ کے گھر بھانجا نہیں رہے گا تو کیا شترمرغ کا بچہ رہے گا؟''

ہنستے ہنستے نسرین کا برا حال ہوگیا تو خالہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ مذاق کررہا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب خالہ نے ظہر کی نماز شروع کی تو وہ کچن میں پہنچ گیا جہاں نسرین برتن دھو رہی تھی۔ اس نے دبے پاؤں پیچھے سے جا کے اسے دبوچ لیا۔ نسرین نے اچھل کے پہلے ایک چیخ ماری پھر سالن پکانے والا چمچہ اس کے سر پر ٹن سے مارا۔

''بیہودہ...... بدتمیز...... بے شرم......''

ندیم سر سہلانے لگا ''گالیاں!! اپنے ہونے والے مجازی خدا کو...... توبہ توبہ!''

''جاؤ یہاں سے'' وہ دانت پیس کے بولی ''اماں آجائیں گی۔''

''میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ پکچر دیکھنے چلو گی؟''

نسرین کا چہرہ کھل اٹھا ''چلو۔''

''لیکن ایک شرط ہے میری؟''

''وہ کیا؟'' نسرین مسکرائی۔

''میں تمہارے لیے جینز اور سلیولیس ٹی شرٹ لایا ہوں۔ وہ پہن کے چلو گی تم...... برقع کے بغیر۔''

''تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو'' اس کا رنگ...

لگا۔

''نہیں منظور تو بھاڑ میں جاؤ۔ میں سونے جا رہا ہوں'' اس نے کچن سے واک آؤٹ کرتے ہوئے کہا۔

اس کے لیے عارضی طور پر ڈرائنگ روم میں ہی بستر لگا دیا گیا تھا۔ وہ لیٹا ہی تھا کہ خالہ نماز سے فارغ ہو کے اپنے پاندان سمیت نازل ہوئیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ فراغت اور دل جمعی کے ساتھ کم سے کم عصر کی نماز کا وقت ہونے تک باتیں کریں گی۔ اس کا یہ حال تھا کہ گزشتہ رات بھی ویران اور بھائیں بھائیں کرتے گھر میں جاگتے ہی گزاری تھی۔ وہ ندیم کی زبان سے یہ سن کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھیں کہ وہ مذاق فرما رہا تھا اور درحقیقت اس کا اپنی پیاری اور اکلوتی خالہ کے گھر میں ڈیرے ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اسے تو اس وقت ڈاکٹر امجد اور اس کی باتیں یاد آ رہی تھیں اور مستقبل کا حسین نقشہ ایک مرتبہ پھر اس کی نگاہوں میں لشکارے مار رہا تھا۔

☆☆☆

ندیم نے مستقبل کے خوابوں کی تصویروں والی کئی البم بنالی تھیں۔ وہ انہی میں سے ایک البم دیکھ رہا تھا اور کمرے میں اندھیرا کیے ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹا تھا اور ان تصویروں کو سینما کے پردے کی طرح تصور کے پروجیکٹر سے روشن کیے دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایشوریا رائے سے زیادہ طرح دار اور شوخ حسینہ جو جھیل سیف الملوک کے برفانی پانی میں شلوار کے پائنچے اٹھائے اس کے ساتھ لگی کھڑی تھی، غائب ہوگئی اور ندیم حقائق کی دنیا میں لوٹا تو یہ بھول گیا کہ دروازے تک اس کی راہ میں ایک کرسی بھی حائل ہے۔ کرسی سے ٹکرا کے وہ لنگڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔

حسب توقع یہ نسرین تھی۔ اندر آتے ہی وہ بھتنی کی طرح ندیم سے چمٹ گئی ''مجھے پتا تھا تم میرے انتظار میں جاگ رہے ہو گے۔''

''جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو'' ندیم نے آواز کے ساتھ کانپنے کی کوشش کی۔

نسرین نے دھکا دے کر اسے بستر پر گرا دیا ''میں بلا ہوں۔''

''تم خوبصورت بلا ہو جو گلے پڑ جائے تو ناگ والے ناگپوری بابا بھی گردن کاٹے بغیر اس سے چھٹکارا نہیں دلا سکتے۔''

''سچ بتاؤ، تم میرا انتظار کر رہے تھے۔'' وہ اٹھلا کے بولی۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں ایک بڑا حسین خواب دیکھ رہا تھا۔''

''خواب میں تمہارے ساتھ میں تھی؟ ہم کیا کر رہے تھے؟'' وہ شرما کے بولی۔

ندیم نے ایک آہ بھری ''معاف کرنا کزن۔ میرے ساتھ مادھوری ڈکشٹ تھی اور ہم بالاکوٹ میں پکوڑے کھا رہے تھے مگر تم کیوں آ گئی ہو؟''

وہ اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی ''تم نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔''

ندیم نے کانوں کو ہاتھ لگایا ''میں قدرت کے معاملات میں دخل کیسے دے سکتا ہوں۔''

''میں تو سمجھی تھی تم نے واقعی اپنا ارادہ بدل دیا۔''

''بیس ہزار روپے مہینہ کی نوکری چھوڑ دوں۔ کیا میرا دماغ خراب ہے؟''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''آخر یہ ساجن پور ہے کہاں؟''

''یہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے درمیان ایک پہاڑی قصبہ ہے۔ جہاز سے اٹھارہ گھنٹے لگتے ہیں۔ اس کے حسن کی کیا تعریف کروں، خود سوئٹزرلینڈ والے اَش اَش کرتے ہیں۔ لیکن اس کا اصل حسن ہیں اس کی حسین نیاریں جو اپنا بیشتر وقت ریشمی لاچے اور ٹی شرٹس وغیرہ میں ملبوس کھیتوں میں ناچتے گاتے گزارتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے [illegible] پانی بھرتی ہیں۔ ان سب کو ہمیشہ انتظار رہتا ہے کہ میرے جیسا کوئی بانکا سجیلا شہری بابو آئے تو وہ اس پر فریفتہ ہوں۔ محبت بھرے ڈائیلاگ تک یاد کر کے رکھے ہیں سب نے۔''

نسرین کی خاموشی سے ندیم نے اندازہ لگایا کہ اس نے چپکے چپکے رونا شروع کر دیا ہے ''تم وہاں جا کے مجھے بھول جاؤ گے؟''

''انشاء اللہ۔'' ندیم نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا اور اپنی غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیرا ''لیکن یہاں تم اس بنگالی بابا کے پاس چلی جاؤ جس نے ہر جگہ لکھ رکھا ہے 'محبوب آپ کے قدموں میں۔ تو ممکن ہے کوئی جن مجھے گردن سے پکڑ کے لے آئے۔''

وہ پھُس پھُس کر کے رونے لگی ''تم روز آ جا نہیں سکتے؟''

''اپنے ابا سے کہو مجھے ایک ائرکنڈیشنڈ کار دلوا دیں اور ایک شوفر رکھ دیں۔ اب بند کرو یہ رونا دھونا اور جاؤ یہاں سے ورنہ میں جھانپڑ مار کے نکال دوں گا۔ میں کوئی عدم آباد تو نہیں جا رہا ہوں۔ اور جا رہا ہوں تو رونے کی کیا ضرورت ہے۔

آ جانا وہاں بھی میرے پیچھے پیچھے۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی ''تم وہاں جاکے ضرور کسی کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ گاؤں کی لڑکیاں دیکھی ہیں میں نے' فلموں میں۔''

ہنسنے کے بجائے ندیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور جذباتی لہجے میں بولا ''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں نسرین! خدا کو حاضر و ناظر جان کے۔ اور اپنی محبت کو گواہ بنا کے کہ......''

''بولونا...... چپ کیوں ہو گئے؟''

''کہ بحالت مجبوری صرف تین کروں گا۔ چوتھی کی جگہ تمہارے لیے خالی رہے گی ہمیشہ۔ اب تم جاؤ' تمہارے اماں ابا......''

''میں نہیں ڈرتی کسی سے......'' اس نے کھٹ سے لائٹ جلا دی۔

ندیم نے گھبرا کے لائٹ آف کر دی ''ہم پکڑے جائیں گے حدود آرڈی ننس میں۔''

''سنو۔ تم نے مکان بھی بیچ دیا۔ اس پیسے سے بزنس کیوں نہیں کرتے؟''

''میں بزنس کرنے ہی ساجن پور جا رہا ہوں۔ یہاں تو اتنی زمین ہی نہیں ہے۔ وہاں کئی فیکٹریاں لگانی ہیں مجھے۔ ایک چوڑیوں کی' ایک لپ اسٹک اور نیل پالش کی۔ اور کچھ مخصوص زنانہ استعمال کی چیزوں کی جن کا نام لیتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اب تم جاتی ہو یا میں خالہ کو آواز دوں کہ میری عزت خطرے میں ہے۔''

وہ ہنسنے لگی ''تمہاری عزت تو میں ہوں۔''

''تم میری عزت کا جنازہ ہو جو ایک دن میرے گھر سے نکلے گا۔''

''بکواس مت کرو۔''

''بابا' یہ تو محاورہ ہے کہ عورت کی ڈولی آتی ہے پیا کے گھر اور جنازہ جاتا ہے۔''

صبح وہ پھر سامان اٹھا کے آٹھ بجے ہی لاری اڈے پہنچ گیا اور چار پہیوں پر قائم اس ڈبے کو دیکھ کر خوش ہوا جسے بس کا نام دے دیا گیا تھا۔ طے شدہ طور پر تقسیم ہند سے پہلے یہ بالکل نئے ماڈل کی بس تھی۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر ڈاکٹر امجد جھوٹ بول کے قابض ہو چکے تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ میں علاقہ مجسٹریٹ ہوں۔ چنانچہ ڈرائیور کے ساتھ وی آئی پی سیٹ پر ان کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا۔

ڈاکٹر ندیم کو ایک سیٹ حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ جنگ لڑنی پڑی۔ ایسا لگتا تھا کہ گزشتہ رات عشا کی نماز پڑھتے ہی ساجن پور کے مسافر بس میں آ بیٹھے تھے۔ خالی سیٹ کے بارے میں ایک نوجوان نے بیان دیا کہ یہاں چاچا بیٹھے گا۔

ندیم نے غرا کے کہا ''چاچا کس کا۔ تمہارا یا میرا اور وہ ہے کہاں؟''

''وہ آنے ہی والا ہے۔''

ندیم نے بزور بازو وہ سیٹ پکڑ لی ''جب چاچا آئے تو تم احتراماً کھڑے ہو جانا بھتیجے۔ اسے اپنی جگہ بٹھا دینا۔ سیٹ کسی کے نام ریزرو نہیں ہے۔''

لڑکا کچھ دب گیا۔ ندیم کو کھڑکی کے قریب جگہ پا کے خوشی بھی ہوئی تھی کہ اسے دوران سفر باہر کی تازہ ہوا ملے گی مگر بیٹھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ دھوپ کی زد میں ہے اور ساجن پور پہنچنے تک اسے غسلِ آفتابی کا اور روسٹ ہونے کا پورا موقع ملے گا۔ اسے ابھی سے پیاس لگ رہی تھی۔ اگلے دو گھنٹے میں سوکھ کے پاپڑ ہونے سے یہ بہتر تھا کہ وہ بس کی روانگی سے قبل منرل واٹر کی ایک بوتل لے آئے اور دو گھنٹے تک پیتا رہے مگر جب وہ لوٹ کر آیا' اس وقت تک چاچا آ کے اپنی جائے مخصوص پر تشریف کو مضبوطی سے رکھ چکے تھے۔ ان کے ہونہار بھتیجے نے ندیم کو اسی کا بیان لوٹا دیا کہ سیٹ کسی کے نام ریزرو نہیں ہوتی۔

اب منرل واٹر کو خون کے گھونٹ کی طرح پی کے صبر کرنے اور کھڑے رہ کر دو [illegible] کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بس بھر چکی ہے اور گزشتہ روز کی طرح مقررہ وقت سے آدھے گھنٹے پہلے ہی عازم سفر ہو جائے گی مگر بس کے مالک اور بکنگ کلرک کے نقطۂ نظر سے بس ابھی خالی تھی۔ وہ اس عالمی فلسفے کے مقلد تھے کہ جگہ تو دل میں ہونی چاہیے چنانچہ سوا نو بجے جب بس روانہ ہوئی تو ندیم کی سمجھ میں آ گیا کہ بس کا بھرنا کیا ہوتا ہے۔ بہتی ناک اور بہتی آنکھوں والا مسلسل ایک ہی سُر اور لے میں ریں ریں کرنے والا ایک بچہ اس کی پتلون کا ایک پائنچا پکڑے کھڑا تھا۔ اس ہاتھ سے وہ وقتاً فوقتاً اپنی ناک صاف کرتا تھا اور پھر ہاتھ کو ندیم کی پتلون سے صاف کر لیتا تھا۔ بچے کے والد ماجد جنہوں نے غالباً گائے بھینس کے گوبر سے کشید کی ہوئی پرفیوم لگا رکھی تھی' پیچھے سے ندیم کے ساتھ معانقہ کر رہے تھے۔ مسافروں میں شامل بکری کا ایک معصوم بچہ بار بار ندیم کی دونوں ٹانگوں میں سے سر نکال کے چلاتا تھا ''اماں!'' اس کی اماں بس میں نہیں تھی ورنہ مامتا سے مجبور ہو کے وہ بھی ندیم کی ٹانگوں میں گھس جاتی۔ ندیم سرنگوں رہنے پر بھی مجبور تھا کیونکہ بس کی چھت ساڑھے پانچ فٹ قد کے اوسط مسافروں کو ذہن میں رکھ کے بنائی گئی تھی۔

ساجن پور میں اتر کے ندیم نے بالکل اس مرغے کی طرح محسوس کیا جسے طوطے کے پنجرے میں بند رکھا جاتا ہو۔ ڈاکٹر امجد وی آئی پی سیٹ پر بیٹھ کے سفر کرنے کے باوجود ندیم سے زیادہ دکھی تھا۔

''یار' سیٹ میں ایک طرف کیل نکلی ہوئی تھی'' اس نے ندیم کے استفسار پر بتایا۔

''تو آپ دوسری طرف ہو جاتے؟'' ندیم نے خوش ہو کے کہا۔

''مشورے کا شکریہ۔ دوسری طرف دو کیلیں تھیں۔ میری تو پتلون بھی پھٹ گئی۔'' وہ بس بنانے والوں سے ساجن پور بسانے والوں تک سب سے خفا تھا۔

ساجن پور لاری اڈے پر قلی کا فیشن نہیں تھا۔ سب مسافر اپنا سامان اپنے بار گناہ کی طرح خود ہی اٹھاتے تھے۔ ذاتی قوتِ برداشت سے زیادہ سامان وہ اپنی نصف بہتر یا والدہ محترمہ کے سر عزیز پر رکھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ جنت تو ماں کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے نا۔

ندیم نے پانچ کا نوٹ دے کر ایک حقہ پیتے ہوئے نوجوان کو سامان اٹھانے پر راضی کر لیا۔ اس نے بیگ اور سوٹ کیس کو سر پر رکھا اور حقہ ہاتھ میں اٹھا کے ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اتنا [illegible] جیسے [illegible] کے سر پر کوئی وزن نہیں۔ امجد کے ڈاکٹر ہونے سے وہ بہت متاثر ہوا اور تقریباً آدھے میل کے سفر میں اس نے دو درجن کے قریب بیماریوں کا ذکر کیا جو پیر کے انگوٹھے سے اس کے دماغ تک ہر حصے کو متاثر کر چکی تھیں اور وہ کوئی ایسی دوا چاہتا تھا جس کی صرف ایک ہی خوراک ان سب کا جڑ سے قلع قمع کر دے۔ انجکشن لگوانے کو وہ خلافِ شرع سمجھتا تھا۔ خدا نے بندے کے جسم میں جتنے سوراخ رکھے ہیں ان میں اضافہ قدرت کے کاموں میں دخل اندازی ہے۔ جان بوجھ کے تو کوئی سائیکل کی ٹیوب کو بھی پنکچر نہیں کرتا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اگر ان کے ہمراہ وہ مرد بیمار نہ ہوتا تو وہ چکر لگاتے رہتے اور کئی بار سرکاری ڈسپنسری کی عمارت کے سامنے سے گزر جاتے۔ گاؤں کی حدود سے باہر واقع وہ عمارت کسی درویش کی خانقاہ نظر آتی تھی۔ اس پر رنگین کاغذ کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں اور چھت پر گوٹے کناری والا سبز پرچم بھی پھڑ پھڑا رہا تھا۔ چھت پر کبوتر بھی قیام پذیر تھے۔

''یہی ہے جی سرکاری اسپتال۔'' ان کا اولین مریض بننے کا اعزاز حاصل کرنے والے نے سامان نیچے رکھ دیا۔

''یہ سرکاری عمارت ہے۔ اس پر کسی اُلو کے پٹھے نے قبضہ کر رکھا ہے'' ڈاکٹر امجد کا پارا چڑھ گیا۔

''یہ کئی مہینے سے خالی پڑی تھی۔ دو مہینے ہوئے ایک ملنگ نے ادھر ڈیرا ڈالا ہے۔ اس کے قبضے میں جنات ہیں۔ خیال کرنا'' اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا ''پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔''

ڈاکٹر امجد نے بند دروازے کو ایک لات ماری تو اس کے دونوں پٹ ایک دھماکے سے کھل گئے۔ اندر فرش خاک پر ایک داڑھی دار بزرگ اپنی توند کے عظیم گنبد کا رخ افلاک کی طرف کیے پڑے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ تخلیہ ہونے کے باوجود انہوں نے نچلے نصف حصے پر ایک تہ بند لپیٹ لیا تھا جو سائز میں تولیے کے برابر تھا۔ اوپر وہ صرف ایک لال پیلے منکوں کی مالا پہنے ہوئے تھے۔

اس نے پہلے اس گستاخانہ دخل در معقولات کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار بڑے جلالی انداز میں کیا مگر حقیقت حال آشکار ہوتے ہی اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور اس نے اپنا اسباب درویشی اور جناتی شعبدہ گری کا سامان فٹافٹ اٹھایا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا کہ ''مرغے کی طرح کڑ کڑ کیوں کرتا ہے بابا۔ ہم کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ تیرے باپ کا گھر ہے'' اس کو اسپیڈ دینے کے لیے ندیم نے غصے میں لات گھمائی تھی مگر وہ ملنگ کے عقبی حصے پر لگنے کے بجائے دروازے پر لگی۔ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔

دوسرے کمرے کا درمیانی دروازہ ابھی تک مقفل تھا۔ غالباً ملنگ کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ وہ تالا توڑ کے سرکاری املاک کو بھی اسباب درویشی میں شامل کر لے۔ تالے کو کھولنے کے لیے کوئی چابی تھی اور نہ اس شخص کا سراغ لگانا ممکن تھا جو آخری بار چابی جیب میں ڈال کے لے گیا تھا چنانچہ ان کے ساتھ قلی اور راہنما کے طور آنے والے نے یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ ایک پتھر کی ضرب مجاہدانہ سے تالا اور کنڈی دونوں توڑ دیے۔

دوسرے کمرے میں کرسی میز اور ایک الماری محفوظ پڑے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو سرکاری املاک کی چوری کا کیس درج کرانے انہیں نہ جانے کتنے کوس پر واقع کسی تھانے میں بھی حاضری دینی پڑتی۔ ان کو یہاں لانے والا مسلسل حقہ گڑگڑانے کے باوجود ایک ہمہ صفت نوجوان ثابت ہوا۔ اس نے اپنا نام ''نون سے نذیر علی'' بتایا اور کہا کہ وہ اسی گاؤں کا باسی ہے۔ کوئی باقاعدہ کام دھندا نہ کرنے کے باوجود وہ بہت سے کام کر سکتا تھا۔ جن میں [illegible]

دیر میں ہی اس نے اپنی افادیت ثابت کر دی۔ اس نے سوکھے کھنٹھ جیسے ہینڈ پمپ کو پانی اگلنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس نے ایک جھاڑ و دریافت کی اور ڈسپنسری کو قابلِ قبول حد تک صاف کر دیا۔ وہ گاؤں کے واحد تنور ہوٹل سے لنچ لانے گیا تو پہلے ہی پیش گوئی کر گیا تھا کہ آج روٹی کے ساتھ چنے کی دال ملے گی۔ دراصل ہفتے کے ہر دن کے لیے مینو برسوں پہلے طے کیا گیا تھا اور اس پر بڑی سختی سے عمل ہوتا تھا۔ بھوک کی شدت میں انہیں یہ لنچ پی سی کے بوفے سے زیادہ مزیدار لگا۔

الماری میں سے کچھ پرانے خستہ حال رجسٹر اور ڈسپنسری کا وہ سرکاری ریکارڈ دریافت ہوا جو محکمۂ آثارِ قدیمہ والے دیکھتے تو مخطوطات میں شمار کرتے۔ اس میں آخری اندراج سات ماہ قبل کا تھا اور آخری مریض کوئی خدا بخش تھا جس کو طاقت کی گولیاں دی گئی تھیں مگر وہ رضائے الٰہی سے فوت ہو گیا۔ یہ بات ریمارکس کے کالم میں لکھی گئی تھی۔ اطلاعِ عام کے انداز میں کسی سابق صاحبِ ذوق اور دور اندیش ڈاکٹر یا اس کے ماتحت نے دیواروں پر ایسے عبرت آموز اشعار فریم کرا کے لگا رکھے تھے کہ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ علاج سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ اور یہ کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ آج تم کل ہماری باری ہے۔ دوسرے شعر میں جس طرح دو مختلف اشعار کے ''ملاپ'' سے تیسرا شعر پیدا کیا گیا تھا' ندیم اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر امجد نے سرکاری قواعد و ضوابط کے مطابق چارج لیا اور ندیم کو سمجھایا کہ آئندہ اسے ریکارڈ کیسے رکھنا ہو گا اور کہاں کہاں ڈاکٹر امجد کے دستخط ثبت کرنے ہوں گے۔ صرف دس منٹ کی مشق سے ندیم نے اس کے دستخط کرنے میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ڈاکٹر امجد فکر مند ہو گیا ''تم تو میرے بینک اکاؤنٹ سے پیسے بھی نکلوا لو گے؟''

ندیم ہنس کے بولا ''انشاء اللہ۔''

ڈاکٹر امجد نے اسے ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے گُر بھی سمجھائے ''تمہیں جوڈو کراٹے باکسنگ پہلوانی وغیرہ کچھ آتی ہے؟''

''مریض کو قابو کرنے کے لیے؟''

''نہیں۔ سو میں سے ننانوے لواحقین موت کو منجانب اللہ مانتے ہیں مگر ایک فیصد کافر بھی ہوتے ہیں جو لٹھ گنڈاسا یا کلہاڑی وغیرہ اٹھا کے ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتے ہیں کہ چاچا فوت ہوا ہے ڈاکٹر کی دوا سے۔ ادھر گولی کھائی' ادھر اندر گولا سا پھٹا۔ چاچا کے کانوں سے دھواں نکلا اور چاچا خلاص۔ ایسے لوگوں سے تم کیسے نمٹو گے؟''

ندیم نے کھڑکی کی طرف دیکھا ''میں ادھر سے کود کے فرار ہو جاؤں گا۔ کالج میں' میں چار سو میٹر کی رکاوٹوں والی دوڑ جیت چکا ہوں۔''

ڈاکٹر امجد نے نفی میں سر ہلایا ''تمہیں اپنے پاس کم سے کم ایک ریوالور ضرور رکھنا چاہیے اور یہ بات مشہور بھی کر دینی چاہیے۔''

''ریوالور میں کہاں سے لاؤں ڈاکٹر صاحب!'' ندیم سر کھجانے لگا۔

''میں تمہیں نقلی لا دوں گا جو بالکل اصلی نظر آتا ہے۔ یہ لوگ اصلی نقلی کے فرق کو کیا جانیں۔ تمہاری جان بچ جائے گی۔ ویسے تو تاریخ میں ایسے کسی واقعے کا تذکرہ نہیں ملتا جب محکمۂ صحت کا کوئی افسر بھولے بھٹکے سے بھی ادھر آیا ہو مگر کیا پتا کسی کو دورہ پڑ جائے۔ وقت ہو تو مجھے مطلع کر دینا۔ وقت نہ ملے تو ڈسپنسری میں تالا لگا کے فرار ہو جانا۔ غیر حاضری پر بعد میں تم سے وضاحت طلب کی جائے گی جس میں یہ مزاحیہ جملہ بھی شامل ہو گا کہ کیوں نہ غفلت برتنے پر تمہیں ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ جواب میں تم کوئی دندان شکن جھوٹ بول سکتے ہو۔ تم کہہ سکتے ہو کہ بلوچستان کے فلاں ممبر اسمبلی کے خسر نمبر دون ادھر سے گزر رہے تھے کہ ان کی کار کو حادثہ پیش آ گیا چنانچہ میں ان کی مرہم پٹی کرنے گیا تھا۔ اگر تم یہ لکھ دو کہ میں ان کی کار کا پنکچر شدہ ٹائر بدل رہا تھا تو سمجھو جان بچ گئی۔ تم ماشاء اللہ ذہین آدمی ہو۔ محنت کرو گے تو فی البدیہہ جھوٹ بولنے کے ماہر بھی ہو جاؤ گے۔ ویسے بھی اپنا دھندا تمہیں جھوٹ پر ہی چلانا ہے۔ اب میں چلتا ہوں' ایسا نہ ہو' بس نکل جائے اور رات کو مجھے اپنی خوبصورت بیوی کے بجائے یہاں تمہارے ساتھ سونا پڑے' نعوذ باللہ۔''

ندیم نے کہا ''فکر نہ کریں سر! آپ کی وی آئی پی سیٹ ریزرو ہو گی۔''

ڈاکٹر امجد نے پھر دکھی نظروں سے ندیم کو دیکھا ''پہلے تو صرف پتلون ہی پھٹی تھی' پھر اس پر بیٹھا تو......''

نون سے نذیر اس جملے کے آخری حصے سے بہت محظوظ ہوا مگر افسوس کہ قارئین کی تفریحِ طبع کے لیے وہ شائع نہیں کیا جا سکتا تاہم عاقلاں را اشارہ کافی است۔

چونکہ بس کو ناند لیانوالہ سے آنا تھا' اس لیے وہ سڑک پر نظریں جمائے لاری اڈے کے برآمدے میں پڑی دو لرزہ براندام کرسیوں پر بیٹھے رہے اور انتظامیہ کی جانب سے فراہم کی جانے والی جوشاندے کا ذائقہ رکھنے والی چائے پیتے رہے۔

ڈاکٹر امجد نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایک اور لیکچر دیا ''یہ جو نون سے نذیر ہے' یہ بندہ بڑے کام کا لگتا ہے۔ اسے اگر تم اپنا معاونِ خصوصی رکھ لو تو بڑے فائدے میں رہو گے۔ وہ مقامی آدمی ہے۔ مقامی لوگوں کے بارے میں اس کی معلومات پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ وہ تمہیں بتا سکتا ہے کہ تمہارے نزول سے قبل کون کس مرض میں اور کب سے مبتلا تھا اور علاج کے لیے کیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب کا دیا ہوا نقش پانی میں گھول کے پیتا تھا اگر خدانخواستہ یہاں پہلے سے کوئی نیم حکیم موجود ہے تو اس کے دستِ شفا پر کتنے فیصد لوگ اعتقاد رکھتے ہیں' حکیم کی ہلاکت آفرینی کے بارے میں ڈس انفارمیشن کی مہم چلانے میں نون سے نذیر اتنا ہی موثر ثابت ہو سکتا ہے جتنا ہر حکومت سے عوام کو بدظن کرنے میں پی ٹی وی کا خبرنامہ ہوتا ہے۔ بزنس از بزنس' تمہیں اس حکیم کو فرشتۂ اجل کا اناڑی ثابت کر کے مقابلے سے خارج کرنا پڑے گا۔ گاؤں میں عموماً دو قسم کے سیانے پائے جاتے ہیں' ایک جو مخبوط الحواس ہونے کے بعد پہنچے ہوئے تسلیم کر لیے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو عمر تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ہر مرض کا علاج تجویز کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس بے شمار جدی پشتی ٹونے ٹوٹکے اور نسخے ہوتے ہیں' جو اللہ کی ساری مخلوق کے کام آتے ہیں خواہ ان کی دو ٹانگیں ہوں یا چار۔ پیپل میں ہے ایسے ٹوٹکے [illegible] اور کالے بکرے کی جمعرات والی مینگنی سفوف اگر اصلی شہد میں ملا کے نہار منہ چٹایا جائے تو اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے' منسوخ...... ایسے ٹوٹکے بہت چلتے ہیں ہر جگہ۔ نون سے نذیر چونکہ بے روزگار بھی ہے اس لیے اگر تم اسے مہینے کے پانچ سو بھی دو تو اس سے ہزار فائدے حاصل کر سکتے ہو۔ یہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اس حد تک تو پتا ہوتا ہے کہ آج مسماۃ فلک بھری نے اپنے شوہر رحم دل خان کے جھانپڑ' گائے کی لات اور ساس کی گالیوں کے علاوہ کیا کھایا تھا۔ نون سے نذیر تمہارا چیف رپورٹر بن سکتا ہے۔ اس سے تمہیں اپنی پریکٹس چلانے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ فی امان اللہ۔ بس کے ڈرائیور نے بھونپو بجا دیا ہے۔''

جب وہ اکیلا واپس پہنچا تو نون سے نذیر نے سوال کیا ''کیا وہ دوسرے ڈاکٹر صاحب چلے گئے؟''

ندیم نے اسے ڈانٹا ''کون سے دوسرے ڈاکٹر صاحب' دوست تھا میرا۔ مجھے چھوڑنے آیا تھا۔''

''اچھا جی! شکل سے تو وہ ڈاکٹر لگتا تھا'' نون سے نذیر نے خاصی حیرانی کا اظہار کیا۔

ندیم نے اپنی متانت میں فرق نہیں آنے دیا ''تمہیں میرا نام معلوم ہے؟''

نون سے نذیر کا سر ندامت سے جھک گیا ''نہیں جی۔''

''میرا نام ڈاکٹر امجد ہے۔''

اور جیسے ہر طرف سے محصور دولہا قاضی کے سامنے ''مجھے قبول ہے'' کہہ کے آدمی سے شوہر بن جاتا ہے' ایسے ہی یہ جملہ بول کے ندیم گویا ڈاکٹر امجد بن گیا۔ اس جعلسازی اور دھوکے بازی کو شہرۂ آفاق نظریۂ ضرورت کی اخلاقی اور قانونی سند حاصل تھی جس کے تحت اگر گدھا بھی ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے کے باوجود شیر ہاؤس پر قبضہ کر لے تو وہی جنگل کا بادشاہ۔ ندیم نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اب وہ خود کو ڈاکٹر امجد ثابت کر کے دکھائے گا اور ان سب خوابوں کو تعبیر دے گا جو ڈاکٹر امجد نے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے اور اسے اُلّو بنانے کے لیے دکھائے تھے' انشاء اللہ۔

نون سے نذیر مختصر سے برآمدے میں بیٹھا' ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور ٹھنڈے حقے کے ساتھ اسی طرح وقت گزار رہا تھا جیسے مجبور شوہر امید کے بر آنے تک اس بیوی کے ساتھ گزارتے ہیں جو امید سے ہو۔

ندیم نے کہا ''نذیر۔ تم کوئی کام کرتے ہو؟''

''ناں جی' ویلا (فارغ) پھرتا ہوں'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''اور کیا کیا کر سکتے ہو؟''

نون سے نذیر نے اس کا جواب بڑی تفصیل سے اللہ کو حاضر و ناظر جان کے دیا۔ چونکہ ندیم کمپچروں والی بوتلیں ڈیکوریشن پیس کی طرح سجا رہا تھا اور ہر قسم کی دواؤں کو جو اس نے ہول سیل ریٹ پر بازار سے خریدی تھیں الماری میں رکھنے میں مصروف تھا اس لیے وہ تب تک سنتا رہا جب تک نذیر بولتا رہا۔ خلاصہ اس کی تقریر دلپذیر کا یہ تھا کہ وہ کسی بھی شریف النفس راہ چلتی بھینس میں سے دو لیٹر خالص دودھ کو کشید کرنے سے نذیراں کی ''کندھا ٹپنے'' (دیوار پھاندنے) تک سب کچھ کر سکتا ہے حالانکہ نذیراں کا جلاد صفت ریٹائرڈ حوالدار باپ بھری بندوق سرہانے رکھ کے سوتا ہے۔

ندیم نے اس کی تقرری کے احکامات جاری کرتے ہوئے اس کی خدمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو ہر مریض (اور اس کے لواحقین) کی نجی زندگی کے بارے میں تمام معلومات فراہم کرے گا خواہ وہ کتنی بھی شرمناک یا لرزہ خیز کیوں نہ ہوں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے دستِ شفا اور اعجازِ مسیحائی کی تشہیر [illegible]

بجائے گا۔ وہ ڈاکٹر کے کلینک میں سارے کام کرے گا۔ ان میں وہ خدمات بھی شامل تھیں، ماسوائے امور افزائش نسل کے، جو بیویاں گھروں میں سرانجام دیتی ہیں یعنی امور خانہ داری۔

پانچ سو روپے ماہانہ کی پکی تنخواہ والی نوکری کا سن کے نون سے نذیر کا وہی حال ہوا جو ندیم کا ڈاکٹر امجد کی آفرسن کے ہوا تھا۔ سخت جذباتی ہو کے اس نے خود کو تاحیات ڈاکٹر صاحب کی غلامی میں دینے کا اعلان کر دیا اور اس کا ہر کام کرنے کا عہد کیا خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔ سو سو کے پانچ نوٹ یکمشت ملنے کے تصور سے اس کی آنکھوں میں وہی نشہ لہرانے لگا تھا جو شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد شب عروسی کے تصور سے دولہا کی آنکھوں میں اتر آتا ہے۔ اس کے لیے نون سے نذیر کو پورا ایک مہینہ انتظار کرنا تھا اور یہ بڑا صبر آزما کام تھا۔

اس نے کچھ دیر بعد حساب لگا کے لب کشائی کی جرأت کی "جناب عالی! یہ تنخواہ روز کے روز نہیں مل سکتی؟ بحساب سولہ روپے چھیاسٹھ پیسے یومیہ۔"

ندیم ہنس پڑا "نہیں۔ مگر یہ لو ایک سو روپے ایڈوانس رکھ لو۔ باقی ملیں گے مہینا پورا ہونے کے بعد۔ اس سے پہلے ایک پیسا بھی مانگا تو سمجھو چھٹی۔"

"نہیں مانگوں گا جی۔ مگر ایک عرض تھی، تنخواہ کا کسی کو پتا نہ چلے۔"

"کیوں؟ کیا سب سے قرض لے رکھا ہے تم نے؟"

"چاچا ایک ایک پیسا رکھوا لے گا۔ اور پھر روز جانے لگے گا سینما دیکھنے شہر۔ میں یہ نذیراں کے پاس رکھوا دوں گا......"

"یہ نذیراں کون ہے؟" نذیراں کے دوبارہ ذکر پر ندیم نے پوچھا "اور تم اس کے پاس اپنی تنخواہ کیوں رکھواؤ گے؟"

"نذیراں ہی تو سب کچھ ہے ڈاکٹر صاحب۔" نون سے نذیر نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا۔ "وہ تو کہتی ہے کہ جی میں کچھ کروں تو اس سے میری شادی ہو سکے۔"

ندیم بہت متاثر ہوا "تم بہت چاہتے ہو نذیراں کو؟"

اس نے شرما کے کہا "ہاں جی۔ ہماری جوڑی تو رب نے بنائی ہے آسمان پر۔ نذیر کے لیے نذیراں۔"

"کیا وہ بہت حسین ہے، گاؤں کی حسینہ نمبر ون ہے۔"

"پتا نہیں جی۔ مجھے تو لگتی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

ندیم نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "فکر مت کرو۔ تمہاری شادی نذیراں سے ہی ہوگی۔ اگر تم نے دل لگا کے کام کیا تو میں اگلے مہینے سے تمہاری تنخواہ دگنی کر دوں گا۔ ایک ہزار روپے۔"

نون سے نذیر پر شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس کی پتلیاں ٹھہر گئیں۔ سانس رک گیا اور وہ منہ کھول کے ہکلانے لگا "ایک...... ایک...... ہاہا...... ہاز" پھر اس نے پنجابی فلم کے ولن کی طرح ایک نعرہ لگایا اور نہایت مضحکہ خیز انداز میں ناچنے لگا۔ ندیم کو اس دیوانگی کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔

ڈاکٹر امجد کے فرمودات عالیہ کے مطابق کامیابی کے لیے ساجن پور کے طبقہ اشرافیہ سے، جن میں اب وہ خود بھی شامل تھا۔ اس کی پی آر کا اچھا ہونا بھی بے حد ضروری تھا۔ چنانچہ شام کے بعد وہ اپنے معاونِ خصوصی کی رفاقت میں گاؤں کے معززین سے ملنے روانہ ہوا۔ سرفہرست چوہدری گلاب دین تھا جس کے پاس سب سے زیادہ زمین تھی اور ان زمینوں پر سب سے زیادہ مزارع کام کرتے تھے۔

"کیسا آدمی ہے یہ گلاب دین؟" ندیم نے راستے میں پوچھا۔

نون سے نذیر نے کچھ سوچ کے سچ بولنے کا فیصلہ کیا "نام تو ہے جی، اس کا گلاب دین۔ مگر ہونا چاہیے تھا کیکر دین۔ کیکر کے کانٹوں جیسی مونچھیں ہیں اس کی۔ اور ہے بھی بڑا کانٹا۔ زہریلا اور خطرناک۔"

پانچ منٹ کے اس بیان سے ندیم نے سمجھ لیا کہ گلاب دین ویسا ہی بدطینت، سفاک اور عیاش وڈیرا ہے جیسا ٹی وی کے اکثر ڈراموں میں پیش کیا جاتا ہے چنانچہ وہ محتاط ہو گیا۔

چوہدری گلاب کی رہائش گاہ نہ جدید طرز کا بنگلا تھی اور نہ قدیم وضع کی حویلی۔ اس کی تعمیر پرانی تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ گاؤں میں بجلی آ جانے کے بعد اندر جدید زندگی کی ساری آسائشات مہیا ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ اپنی زمینوں کی وسعت، اپنی حویلی کی شان و شوکت، اپنے اثر رسوخ اور اپنی دولت مندی کے باعث چوہدری گلاب دین کی حیثیت ساجن پور کے بے تاج بادشاہ سے کم نہ تھی۔

حسب توقع نون سے نذیر کو باہر ہی روک لیا گیا اور وہ برامدے کے باہر گیٹ سے ذرا ہٹ کے لگی ہوئی سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہ بینچ اسی جیسے کم ذات اور کمینے لوگوں کا ڈرائنگ روم تھی۔ ڈاکٹر امجد کو ایک ملازم حویلی کے گرد لگے ہوئے باغ میں لے گیا جہاں لان پر ایک نیم دائرے میں لوہے کے تاروں سے بنی ہوئی دس کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نصف دائرے کے مرکز میں مگر کافی فاصلے پر ایک ویسی ہی کرسی رکھی گئی تھی۔ جیسی اسٹیج پر مہمان خصوصی کو نمایاں کرنے کے لیے رکھی جاتی ہے۔ لوہے کی کرسیاں ایسی بنائی گئی تھیں کہ ان پر بیٹھنے والا پاؤں پھیلا کے گستاخانہ انداز میں نیم دراز نہ ہو سکے۔ وہ ٹیک لگائے تب بھی اس کی کمر بالکل سیدھی رہے اور پاؤں سمٹے رہیں۔

کرسی صدارت پر چوہدری گلاب دین تشریف فرما تھا اور اس کے مقابل دو افراد باادب بیٹھے ہوئے تھے۔ چوہدری نے کرسی پر حرکت کیے بغیر اپنا دایاں ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا کہ ڈاکٹر صاحب اسے مصافحے کے لیے تھامنے کا اعزاز حاصل کر لیں۔ ندیم سلام کر کے سامنے بیٹھ گیا۔

چوہدری گلاب دین نے بے حد اخلاق کا مظاہرہ کیا "ہمیں پتا چلا تھا کہ خیر سے ایک اور ڈاکٹر نے ڈسپنسری کا چارج لیا ہے۔ پچھلے دو سالوں میں یہاں بھیجے جانے والے تم چوتھے ڈاکٹر ہو۔ تم نے کیا جرم کیا تھا؟"

"جرم......؟" ندیم چونکا۔

"ہاں جرم۔ کسی افسر سے لگ گئی تھی یا تم اوپر والوں کو پورا حصہ نہیں پہنچاتے تھے۔ یہاں تو سزا یافتہ ہی آتے ہیں" چوہدری نے کہا۔

"آپ کی دعا سے ایسی کوئی بات نہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں یہیں رہوں گا۔"

دونوں درباری ہنسنے لگے "پہلے والے بھی ایسا ہی کہتے تھے۔"

ندیم نے ایک بے حد سیاسی مصلحت والا بیان دیا "بات یہ ہے چوہدری صاحب، کہ ہر ایک کی اپنی مجبوری ہوتی ہے۔ کوشش کرتا تو میں بھی شاید کہیں اور چلا جاتا۔ سفارش نہ ہو تو رشوت دے کے اپنی مرضی کی جگہ مل ہی جاتی ہے مگر مجھے ساجن پور ٹھیک لگا۔ میں اپنی مرضی اور ارادے سے یہاں آیا ہوں اور یہاں مستقل رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس میں مجھے آپ کے تعاون اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بہر حال میں یہاں اجنبی ہوں لیکن میں آپ لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے شہر جانے کی کوئی مجبوری نہیں، خدا کے فضل سے آمدنی پہلے بھی کم نہیں تھی۔ میں یہاں تنخواہ کے لیے نہیں خدمت خلق کے لیے آیا ہوں۔ شہر میں میرے ماں باپ، بہن بھائی کوئی نہیں۔"

ندیم کو خود اپنے آپ سے ایسی دانشمندانہ گفتگو کی توقع نہ تھی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ پی آر کے پہلے ہی راؤنڈ میں اس نے میدان مار لیا ہے۔ اس کی صاف گوئی اور اس کے انکسار نے خوشامد پسند وڈیرے چوہدری گلاب دین کے رعونت چہرے کی درشتی کو ایک مربیانہ اور دوستانہ مروت میں بدل دیا۔

اس نے مسکرا کے کہا "او جی ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں خدمت خلق کے لیے آئے ہو تو خلق ساری آپ کی خادم ہو گئی، مریض تو ہم بھی آپ کے ہی ہوں گے۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، کوئی کام ہو، ہمیں حکم کرو، ہم ہر وقت حاضر ہیں۔"

شاید یہ آخری الفاظ ایسے تھے جو وڈیرے کے لبوں سے باقاعدہ حاضری دینے والے درباریوں نے کبھی نہیں سنے تھے چنانچہ وہ ڈاکٹر کی اتنی عزت افزائی پر دم بخود رہ گئے۔ گلاب دین نے ایک کا تعارف پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر کرایا۔ دوسرا ایک غیر معمولی تاجرانہ ذہانت رکھنے والا شخص تھا جس نے گاؤں کی سطح پر ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور بنا لیا تھا۔ چنانچہ ایک طرف اس کے پاس نومولود کو دی جانے والی گھٹی ملتی تھی تو دوسری طرف کفن کا لٹھا بارعایت دستیاب تھا۔ پرچون کا سارا سامان اس کے علاوہ تھا۔ انہوں نے چوہدری گلاب دین سے بڑھ کر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے حاضری لگوانے والے معززین میں ایک سابق ریلوے گارڈ تھا۔ اس کی جسامت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ انجن فیل ہو جانے کی صورت میں وہ گاڑی کو خود کھینچ کر لے جاتا ہوگا۔ پھر ایک رئیسانہ شان والا شخص آیا جسے کسٹم کے محکمے میں چپراسی رہنے کا اعزاز حاصل تھا۔ نذیراں کا سابق حوالدار ابا آخر میں آیا۔ وہ عورت مرد، گدھے گھوڑے کو ایک آنکھ سے دیکھتا تھا کیونکہ اس کی دوسری آنکھ کسی جنگ میں توپ کا گولا لگنے سے شہید ہو گئی تھی۔

ہر معزز مہمان کے تشریف رکھتے ہی ملازم لپک کے آتا تھا اور گاڑھی ملائی دار لسی کا ایک لیٹر والا ایک فٹ کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ اسے ختم نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باقی لسی اسے لمبا ڈال کے اس کے حلق میں اس نلکی کے ذریعے اتار دی جاتی جو بھینس کو تیل پلانے کے مشکل عمل کو آسان بنا دیتی تھی۔ ندیم نے ہمتِ مرداں، مددِ خدا کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے وہ گلاس خالی کر دیا۔ بے شک اس کا پیٹ ساتویں مہینے کی حاملہ عورت جیسا ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے حلق سے اوپر تک بھر جانے کے بعد لسی اس کی ناک سے اور کانوں سے فوارے کی طرح نکلنے لگے گی۔ دیگر درباری ہونٹ چاٹتے اور ڈکاریں مارتے رخصت ہوتے رہے لیکن ڈاکٹر امجد کو چوہدری صاحب نے روکے رکھا۔ جب بالآخر اس نے کہا کہ آج آپ ہمارے مہمان ہو۔ کھانا کھا کے جانا۔ تو ندیم پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ تکلف یا انکار کرنا گستاخی کے مترادف سمجھا جاتا۔ اس نے ہمت سے کام لے کر اس حد تک کہا کہ آپ کا دیا تو کھاتے ہی رہتے

گے۔ دعوت پھر کبھی سہی۔ مگر اس کی جاں بخشی نہیں ہوئی۔ چنانچہ جب وہ بعد نماز عشا پلاؤ زردہ' قورمہ اور سالم کگڑ روسٹ اپنے پیٹ میں کوٹ کوٹ کر بھرنے کے بعد روانہ ہوا تو کسی شتر مرغ کی طرح چل رہا تھا۔ جس کی ٹانگیں پولیو سے متاثر ہوں۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے معدے سے ابل ابل کے کھانا اس کے دیگر اعضائے رئیسہ دل' جگر' گردوں اور پھیپھڑوں میں بھی بھر گیا ہے۔ اسے سانس لینا محال ہو رہا تھا اور اسے یقین آنے لگا تھا کہ آدھے راستے میں ہی اس کا پیٹ ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اس کی کھال اتنی کھنچی ہوئی تھی کہ اسے کانگو ڈرم کی طرح بجایا بھی جا سکتا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح ڈاکٹر صاحب' ایک کاچھا زیب تن فرمائے ہینڈ پمپ کے نیچے مرغا بنے غسل صحت فرما رہے تھے اور ان کا معاون خصوصی بڑے جوش و خروش سے ہینڈل چلا رہا تھا کہ پہلا مریض نمودار ہو گیا۔ ''ہائے میں مر گیا'' کی گردان کرتے ہوئے وہ سیدھا ہینڈ پمپ پر جا کے اپنی ڈوبتی نبض دکھانا چاہتا تھا مگر نون سے نذیر نے اسے بھگا دیا ''اوئے پاگل دے پتر' ادھر جا کے بیٹھ۔''

بلالحاظ عمر کسی کو بھی ایسے مخاطب کرنے سے اپنائیت کا اظہار ہوتا تھا۔ جب جاں بلب مریض برآمدے میں بیٹھ کے مرمرے کے فیملی سائز لڈو کھانے لگا تو ندیم کو ایک خیال آیا۔ اس نے اپنے معاون خصوصی سے کہا ''اسے سمجھا دے کہ ابھی اسپتال چالو نہیں ہوا۔ اس کا افتتاح کل چوہدری گلاب دین صاحب فرمائیں گے۔''

ندیم کی یہ سیاسی چال بے حد کامیاب رہی۔ اگلے دن شام سے پہلے چوہدری صاحب کے ملازمین نے ڈسپنسری کو رنگین جھنڈیوں سے سجا دیا۔ گاؤں کے تمام معززین کے لیے کرسیاں لگا دی گئیں اور آخری وقت میں دو ٹوکرے بھی آ گئے جن میں مقامی سویٹ شاپ کے ایجاد کردہ اخروٹ جیسے سخت لڈو بھرے ہوئے تھے۔

معززین کی تعداد کو پچاس تک محدود رکھا گیا تھا۔ ان میں گرد و نواح کے دیہات کے کچھ زمیندار بھی شامل تھے' جن کے ساتھ چوہدری گلاب دین کے مراسم دوستانہ تھے۔ اکثریت دشمنوں کی تھی۔ انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کی وجہ سے ایک انتظامی مسئلہ پیدا ہوا۔ وہ بن بلائے آئے اور کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ دیر سے آنے والے اصل معززین کھڑے رہتے یا اپنی تشریف کو فرش خاک پر رکھتے۔

معزز حضرات کو چن چن کر اٹھایا گیا۔ ان میں سے کچھ عزت کے معاملے میں اتنے حساس تھے کہ انہوں نے تقریب کا بائیکاٹ کر دیا۔ عزت کو آنے جانے والی چیز سمجھنے والے پہلی صف سے بھی آگے آ کے بے تکلفی سے نیچے بیٹھ گئے۔ قطعی غیر معزز تماش بینوں کو سو قدم کے فاصلے سے یہ اسٹیج ڈراما دیکھنے کی اجازت تھی۔ اس کے لیے برآمدے کو واجبی حد تک اسٹیج کی شکل دے دی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے زیر استعمال ڈسپنسری کی میز پر ایک بڑا سا گلدان رکھا گیا تھا جو درحقیقت ایک حقے کا نچلا حصہ تھا۔

جب صاحب صدر اپنی کرسی پر تشریف فرما ہو گئے تو ان کے دائیں ہاتھ پر ڈاکٹر صاحب کو بٹھایا گیا اور بائیں جانب علاقہ تھانے دار کو جو بجو کی شکل کا ایک حوالدار تھا اور حرام کھانے کے فن میں طاق تھا۔ گاؤں کے چیف مولوی نے قرأت کے بعد ایک طویل دعا مانگی جس میں آمین کہنے والوں کو یہ نوید بھی دی گئی تھی کہ اس ڈسپنسری سے علاج کرانے والے اگر قضائے الٰہی سے اللہ کو پیارے ہو گئے تو شہید کہلائیں گے۔

چوہدری گلاب دین نے موبائل ہیئر کٹنگ سیلون کے پروپرائٹر موجو نائی کے پیش کردہ استرے سے فیتہ کاٹ کے ڈسپنسری کا افتتاح فرمایا کیونکہ مشکل سے بال کاٹنے والی قینچی نے فیتہ کاٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ [illegible] بھی وہ استرا [illegible] مبارک تھا۔ اسی کی آب و تاب کے باعث گاؤں کی بیشتر اولاد نرینہ مسلمان کہلانے کے قابل ہوئی تھی۔

معززین کو چبانے کے لیے دو لڈو فی کس اور پینے کے لیے لسی کا ایک گلاس دیا گیا۔ مجمع عام میں ایک لڈو کے حصول کے لیے گھمسان کا رن پڑا۔ کچھ لوگ ایک لڈو فوراً نگل کے دوسرا بھی لے گئے۔ ایسی ہی ایک پُرطمع کوشش میں ساٹھ ستر سال کے بزرگوار کی دھوتی کھل گئی اور ایک شخص کے کندھے پر بندر کی طرح براجمان بچہ نیچے ٹپک گیا۔

ندیم یعنی ڈاکٹر امجد نے اگلے دن سے باقاعدہ علاج معالجے کا آغاز کیا۔ گاؤں میں ایک حکیم بھی تھا جو پہلے کئی ڈاکٹروں کے خلاف پروپیگنڈا مہم چلا چکا تھا کہ انگریز کی بنائی ہوئی دوائیں گرم ہوتی ہیں اور جگر کو جلا دیتی ہیں۔ مزید یہ کہ ان میں حرام اشیا بھی شامل ہوتی ہیں۔ مگر اب لوگوں نے اس پر یقین کرنا چھوڑ دیا تھا۔

پہلے دن صرف پانچ مریض آئے۔ دوسرے دن ان کی تعداد دگنی ہو گئی۔ کھانسی بخار یا بدہضمی سب سے مقبول امراض تھے۔ ندیم انہیں گولیاں اور [illegible] دیتا رہا لیکن تیسرے دن وہ

ہنگامہ سن کے باہر نکلا تو اس کے معاون خصوصی نون سے نذیر نے ایک جلوس کی طرف اشارہ کیا' جلوس میں چار ہانپتے ہوئے نوجوان تھے جو جنازے کی طرح ایک چارپائی اٹھا کے لا رہے تھے' ان کے پیچھے چار خواتین اور ان کی جملہ پیداوار واویلا کرتی چلی آ رہی تھی۔ ندیم سمجھ گیا کہ مریض غالباً ''ایمبولینس'' کے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس کی بیوی اب بیوہ اور بچے یتیم ہو چکے مگر ایمبولینس اٹھا کے لانے والوں نے چارپائی کو دھڑام سے نیچے رکھا تو مریض بقائمی ہوش و حواس دنیا پر الوداعی نظریں ڈالنے میں مصروف تھا۔ ندیم کو بتایا گیا کہ مریض کو سانپ نے کاٹ لیا ہے جو مریض سے لمبا اور غالباً اس سے زیادہ خطرناک تھا۔ ندیم کو معلوم تھا کہ نوّے فیصد سانپ زہریلے نہیں ہوتے چنانچہ مریض کے بچ جانے کے امکانات بھی نوّے فیصد تھے۔ تاہم اس نے لواحقین کی تسلی کے لیے زخم کی جگہ ایک غیر ضروری چیرا لگایا۔ تھوڑا ''زہریلا'' مواد خارج کیا اور پھر مرکیورو کروم لگا کے پٹی باندھ دی۔ اس نے احتیاطاً مریض کو ایک اینٹی الرجک انجکشن بھی لگا دیا۔ یہ سب نہ کیا جاتا تب بھی مریض فوت نہ ہوتا۔ شام تک ندیم کے اعجاز مسیحائی کا شہرہ ہو گیا۔

ندیم کے پاس مفت کی دواؤں کی کمی نہ تھی۔ وہ ڈاکٹر امجد کے پاس [illegible] کی طرف سے مفت تقسیم کیے جانے والے سیمپل کثیر تعداد میں اٹھا لایا تھا جو اسے ڈاکٹر امجد نے بڑی محنت سے جمع کر کے دیے تھے مگر زخمیوں کی مرہم پٹی اسے اپنے پاس سے کرنی پڑ رہی تھی۔ درمیان میں وہ ایک بار لاہور گیا تو ڈاکٹر امجد نے اسے کچھ تحائف پیش کیے۔ ان میں بلڈ پریشر دیکھنے کا ایک آلہ اور عام جراحی کے آلات اور ایک اصلی پستول شامل تھا۔

ندیم کے ہاتھ کانپنے لگے ''آپ نے تو نقلی کہا تھا۔''

''یار' یہ ستا مل گیا۔ فکر مت کرو۔ کچھ ڈاکو پکڑے گئے تھے۔ یہ انہی سے برآمد ہوا تھا۔ تھانے کے ایک سپاہی نے چوری چھپے ہزار روپے میں مجھے دے دیا۔ میں نے سوچا تمہاری حفاظت کا بھی انتظام تو ہونا چاہیے۔ کیا پتا کسی روز اصلی ڈاکو آ جائیں پھر......''

ندیم مسکرانے لگا ''دوائیں لوٹنے؟ وہاں اور کیا ہے؟''

ڈاکٹر امجد نے مذاق میں کہا ''یار' تم بھی تو ہو۔ فی الحال اس میں چھ گولیاں ہیں۔ تمہیں سات خون معاف ہیں۔ اگر تمہارے چوہدری اور تھانے دار سے اچھے مراسم ہیں۔''

پہلے مہینے میں ندیم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ گاؤں میں اسے کس قسم کی دواؤں کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔ اگر کسی کو کتا کاٹ لیتا تھا تو اسے وہ سیدھا شہر بھیج دیتا تھا کیونکہ وہ انہیں چودہ ٹیکے نہیں لگا سکتا تھا۔ غربت اور جہالت کا کوئی علاج نہیں تھا۔ کسی کو ہارٹ اٹیک ہو جائے اور وہ بچ جائے تو والی وارث اسے کمزوری کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ بندہ کمزور ہو تو دل بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ وہ اسے خالص دودھ میں دیسی گھی ملا کے پلانے لگتے تھے۔ بندہ اگلے دورے میں اللہ کو پیارا ہو جاتا تھا۔ اوسطاً اس کے پاس ہر روز علاج کے لیے دس سے پندرہ مریض آتے تھے۔ نذیراں کا یک چشم سابق حوالدار باپ جو پہلے نون سے نذیر کو گولی مار دینے کی دھمکی دیتا رہتا تھا' اب اکثر طاقت کی ''خاص'' گولی طلب کرنے کے بہانے آ جاتا تھا اور ایک ہزار روپے ماہانہ کے اعلیٰ مشاہرے پر ملازم اپنے متوقع داماد کے سر پر دست شفقت بھی پھیرتا تھا۔ دیگر عمائدین کی طرح وہ مصلحت کے پیش نظر چوہدری گلاب دین کے ڈیرے پر باقاعدگی سے حاضر ہوتا تھا۔ تین بار اس نے چوہدری کا اور دو بار اہل خانہ کا شافی علاج کیا۔ ایک بار اسے رات دو بجے طلب کیا گیا اور اسے زنان خانے میں دو نمبر چوہدرائن کو دیکھنے جانا پڑا۔ چوہدری نے اس کے سرہانے سورۂ یٰسین پڑھنے کے لیے مولوی صاحب کو بھی بلوا لیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ باتھ تھام کے نبض دیکھنے کے علاوہ ندیم کو چوہدرائن کے بالائی جسم کے ممنوعہ حصوں کو آلات کی مدد سے دیکھنے کی اجازت بھی دی گئی۔ اس پر کسی الرجک ری ایکشن کی وجہ سے دمے کا اٹیک ہوا تھا۔ ندیم نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے مریضہ کو منہ کھول کر دو ''پف'' دیے اور سانس اندر لینے کو کہا۔ ایک اینٹی الرجک انجکشن لگایا اور جب دیکھتے دیکھتے آدھے گھنٹے میں وہ بالکل ٹھیک ہو گئی تو سب سے پہلے چوہدری نے مولوی کو بھگایا۔ پھر ندیم کو گلے لگا لیا۔ وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا اور اس علاج کو ایک معجزہ قرار دے رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد ندیم کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا۔ اسے نہ صرف یہ کہ چوہدری کے معالج خصوصی کی حیثیت حاصل ہو گئی بلکہ وہ چوہدری کے خاص الخاص دوستوں میں شامل ہو گیا۔

موقع پاتے ہی ندیم نے اس سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا۔ سرکاری بجٹ جو دواؤں کے لیے ملتا ہے بارہ سو روپے ہے۔ اسپتال میں روز آتے ہیں پندرہ بیس مریض۔ مہینے کے چھ سو سمجھ لو۔ دو سو روپے مہینا میں ان کو میں کیا دوا دوں؟ کیسے دوں' پیسے لوں تو پکڑا جاؤں گا۔ علاج کے لیے آنے والوں سے کہوں کہ دوا نہیں ہے تو مارا جاؤں گا۔''

چوہدری نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا ''یار! تو بھی وہی کر جو سب کرتے ہیں۔''

''سب کیا کرتے ہیں؟'' ندیم نے معصوم بن کے پوچھا۔

''پرائیویٹ پریکٹس اور کیا۔ شام سے رات تک اپنی دکان چلاؤ۔ دوائی کے نقد پیسے لو۔ جو پیسے نہ دے اسے کہہ دیا جائے لاری میں بیٹھ کے شہر جائے اور میو اسپتال میں خوار ہو کے آجائے۔ ساٹھ روپے تو لاری کا کرایہ لگتا ہے ایک بندے کا۔ اس کے ساتھ بھی کوئی جائے گا تو ایک سو بیس۔ اس سے اچھا نہیں ہے کہ یہیں سے دوا خرید لیں، بے شک ایک سو بیس ہی دینے پڑیں۔ آنے جانے سے تو بچیں گے اور لاری جاتی ہے دن میں ایک بار۔ ایک دن جاؤ تو دوسرے دن آؤ۔ ملک الموت اتنی مہلت دے گا؟''

یہ گاؤں کی اعلیٰ ترین اتھارٹی کی طرف سے پرائیویٹ پریکٹس کے ذریعے مال کمانے کا اوپن جنرل لائسنس تھا۔ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اگلے مہینے میں تواتر کے ساتھ پیش آنے والے دو واقعات نے اس کی ساری خوش فہمی دور کر دی۔

☆☆☆

وہ اپنے کلینک سے معمول کے مطابق رات نو بجے اٹھا تو واپسی میں چوہدری گلاب دین کے ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ گزشتہ ہفتوں میں یہ معمول اس کے لیے زیادہ سے زیادہ صبر آزما ہوتا جا رہا تھا۔ چوہدری گلاب دین کی مربیانہ اپنائیت ندیم کو مہنگی پڑنے لگی تھی۔ اس نے اپنی طرف سے بڑی فہم و فراست کا ثبوت دیا تھا کہ حاکم کے دربار میں حاضری دے کر اپنے منصب کو محفوظ کر لیا تھا اور ایک خوشحال مستقبل کی منزل تک جانے والے راستے کی تمام رکاوٹوں کو ایک جست میں عبور کر لیا تھا۔ ڈاکٹر امجد اس کی حکمت عملی سے بہت مطمئن تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ ندیم کو احساس ہونے لگا تھا کہ چوہدری کا حلقہ بگوش ہو کے اسے عام لوگوں کی نظر میں بڑی عزت ملی ہے لیکن یوں شاہ کا مصاحب ہو کے وہ آزاد نہیں رہا۔ اب اس کے لیے لازم تھا کہ وہ ہر رات کلینک بند کرنے کے بعد چوہدری کی خدمت میں حاضر ہو۔ اس کے ساتھ رات کا کھانا کھائے اور اس دوران میں مؤدب رہتے ہوئے چوہدری کی خاندانی آن بان اور شان کے جھوٹے سچے قصے سنے۔ ہر معاملے میں اس کی جاہلانہ رائے سے اتفاق کرے اور اس کی

چوہدری اس کا عادی ہو چکا تھا مگر ندیم کے لیے ''عمائدین'' کی عادات و اطوار اختیار کرنا ایک آزمائش بن گیا تھا۔

چوہدری نے حویلی میں آنے والوں کی درجہ بندی روایتی انداز میں کی تھی۔ ایک تو وہی کمی کمین تھے جو حویلی کے اندر ہر قسم کی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ پیدائشی بے عزت تھے اور جن کی حیثیت چوہدری کے کتوں کے برابر بھی نہیں تھی۔ دوسرے وہ تھے جو چوہدری کے غلام یا محتاج تو نہ تھے مگر معزز بہرحال نہیں تھے۔ تیسرے طبقے میں وہ تھے جن کو چوہدری عزت دیتا تھا چنانچہ وہ معزز تھے لیکن ان سب سے اوپر چوہدری کے خاص بندے تھے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔

ندیم اب چوہدری کا خاص الخاص بندہ ہو گیا تھا اور اسے تقریباً گھر کے ایک فرد جیسی عزت دی جاتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ چوہدری کی پوری فیملی کا مشیر صحت تھا اور اپنے اعجاز مسیحائی کا مظاہرہ کئی بار کر چکا تھا۔ فیملی میں دو بھائیوں، ان کی بیویوں، ان کی مجموعی پیداوار یعنی ڈیڑھ فٹ سے چھ فٹ تک کے لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔ چوہدری کی سینئر اور خاندانی سمجھی جانے والی بیوی نمبر ون کی عمر اب چالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک بھدی موٹی کرخت آواز کی حامل ہر وقت مصنوعی رعب داب میں رہنے والی عورت تھی۔ شادی کے بعد اس کے تین لڑکیاں ہوئی جو اب اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ خطرہ تو اسے بہت پہلے سے تھا کہ اولاد نرینہ کی فطری خواہش کو شرعی عذر بنا کے چوہدری ایک اور شادی جب چاہے کر سکتا ہے مگر خاندانی برتری یا شاید اس کی خوش قسمتی کے باعث یہ سانحہ بیس سال بعد پیش آیا جب ایک معمولی خاندان کی لڑکی اپنے حسن و شباب کے سفلی عمل سے چوہدری کو الو بنا کے حویلی میں اپنی مستقل جگہ بنانے میں کامیاب رہی تھی ورنہ ان بیس برسوں میں نہ جانے کتنی آئیں اور گئیں۔

اب صورت حال عملاً یہ تھی کہ بیوی نمبر ایک بہ لحاظ عہدہ گھر پر راج کرتی تھی اور بیوی نمبر دو اپنے جوان جسم کی شادابی اور ناز و ادا کی شوخی سے چوہدری کے دل پر راج کر رہی تھی۔ شادی کے تین سال بعد بھی اولاد نرینہ تو کیا، اس نے چوہے کا بچہ تک نہیں جنا تھا چنانچہ اپنی جگہ تیسری کے آنے کا خیال اسے بھی پریشان کرنے لگا تھا، نتیجہ یہ کہ اس نے اپنے عشوہ و غمزہ و ادا کے دو چند بڑھا دیے تھے اور کسی حد تک طوائفانہ حربوں سے چوہدری کو زیر دام رکھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

ندیم کو اس کے ماضی، حال یا مستقبل سے کوئی سروکار نہ

دس منٹ میں اس کو بالکل نارمل کر دیا تھا تو اس نے بڑی ادا سے شرما کے ندیم کا شکریہ ادا کیا تھا کہ آپ کے ہاتھوں میں تو جادو ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہفتے بھر بعد ندیم کو پھر ایمرجنسی میں طلب کیا گیا اور اس نے چوہدرائن کا تیزی سے چلتے ہوئے سانس کے ساتھ اوپر نیچے ہوتا سینہ دیکھا تو وہ کچھ جھجکا کیونکہ قمیص کا گریبان فیشن کی شہری انتہا تک کشادہ تھا۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست۔ اس نے دل کی دھڑکن سننے والے آلے کی مدد سے سنا تو سانس کے ساتھ سیٹی جیسی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ندیم چکر میں پڑ گیا۔ یہ دمے کا دورہ نہیں تھا چنانچہ وہ اسے بلاوجہ ''پف'' استعمال کرانا نہیں چاہتا تھا۔

''ویسے تو کوئی بات نہیں'' ندیم نے زیر لب کہا۔

وہ کراہی ''اچھی طرح دیکھو ڈاکٹر صاحب!''

ندیم نے پھر اسٹیتھ اسکوپ اس کے جوان سینے پر دبا دبا کے رکھا اور کوئی غیر معمولی آواز سننے کی کوشش کی مگر سب کچھ نارمل تھا۔ اس کا سانس چلنا ایک مصنوعی حرکت لگتی تھی۔ لیکن یہ بات وہ چوہدری کے سامنے کیسے کہہ سکتا تھا۔ جب وہ اس کا گورا گورا گدرایا ہوا بازو تھام کے اس پر جھکا ہوا تھا تو چوہدرائن نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ زیر لب مسکرائی اور پھر اسے آنکھ ماری۔ ندیم کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ چوہدرائن کی مکاری اب اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اسے کوئی بیماری نہیں تھی۔ وہ خود تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

ندیم گھبرا کے ہٹا ''میں اب چلتا ہوں چوہدری صاحب! یہ دس منٹ میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

چوہدرائن نے کراہ کے کہا ''چوہدری صاحب! ڈاکٹر سے کہو جی ذرا رک کے، میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

چوہدری نے حکم دیا ''تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔''

ندیم ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چوہدرائن سے آنکھیں چرا رہا تھا اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا تھا۔ چوہدرائن کی نیت کا فتور واضح ہو گیا تھا اور اب ندیم کو یہ فکر لاحق تھی کہ وہ خود کو اس مصیبت سے کیسے محفوظ رکھے جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تصور میں گنڈاسے، ٹوکے اور کلہاڑیوں کے چمکتے پھل دیکھ رہا تھا جو اس کے سر کو اس کی گردن سے ایسے جدا کر سکتے تھے کہ وہ فٹ بال کی طرح لڑھک کے چوہدری کے قدموں میں جا گرے۔

دس منٹ بعد جب وہ پھر اجازت لینے کی سوچ رہا تھا اچانک چوہدرائن نے کہا ''چوہدری صاحب!''

اس نے اپنے گریبان میں سے ایک چابی برآمد کی ''وہ جو ساتھ والے کمرے کی دیوار میں الماری ہے، جس میں زیور ہیں میرے۔ اس میں دم کیے ہوئے پانی کی ایک شیشی رکھی ہے۔ مولوی صاحب نے دی تھی۔ کہا تھا دل گھبرائے تو چند قطرے پی لینا۔ وہ لے آؤ ذرا۔''

یہ درخواست ایسے دل گداز لہجے میں کی گئی تھی کہ چوہدری سے سر کے بل جانے کے لیے کہا جاتا یا ایک ٹانگ پر، وہ جاتا۔ اس کا باپ بھی جاتا اور اس کے جاتے ہی چوہدرائن نے ندیم کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سینے پر رکھ لیا ''ہائے دیکھو تو سہی۔ کیسے دھڑک رہا ہے دل۔''

ندیم کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ اس نے گھبرا کے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے کھینچا ''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟''

وہ ہنسی ''اپنے دل کا حال سنا رہی ہوں ظالم!''

ندیم کے بدن پر کپکپی طاری ہونے لگی اور اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اس چالاک عورت نے بڑی صفائی سے اپنے خصم کو وہاں سے ٹال دیا تھا اور اب ندیم سے آشنائی کا کھیل کھیلنے پر کمربستہ تھی۔

''میں عاشق ہو گئی ہوں تم پر۔'' اس نے ہونٹوں سے چومنے کی آواز پیدا کی۔

ندیم کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی پتلون خراب ہو جائے گی۔

''کدھر ہے یار وہ شیشی!'' دوسرے کمرے سے چوہدری کی آواز آئی۔

''ہائے ذرا دھیان سے دیکھو۔ وہیں ہو گی'' وہ بڑی ادا سے بولی اور ندیم کی طرف دیکھ کے مسکرائی ''ذرا پیار تو کر لو، بڑا ٹائم ہے ابھی'' اس نے اپنا منہ اوپر اٹھا دیا۔

ندیم بڑبڑا کے بھاگا۔ دوسرے کمرے میں اس نے ایک بے وقوف شوہر کو الماری میں وہ شیشی تلاش کرتے دیکھا، جس کا شاید وجود ہی نہیں تھا۔ بعد میں اس نے بڑی قاتل ادا کے ساتھ کہا ہو گا۔ ہائے میں کہیں اور رکھ کے بھول گئی شاید۔

اس کے بعد ندیم کو دو بار طلب کیا گیا۔ پہلی بار تو اسے موقع نہیں ملا مگر دوسری بار چوہدرائن نے شوہر کی نظر بچا کے اپنے سرکش بدن کی سر بفلک پہاڑیوں کی وادی سے ایک نمی زدہ پرچی برآمد کی اور ندیم کی مٹھی میں تھما دی۔ ندیم کا پیشاب خطا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اسے مشکل سے اتنا وقت ملا کہ پرچی کو مٹھی میں دبا لے اور پھر پتلون کی جیب میں منتقل کر دے۔ یہ رقعہ اس دستی بم سے زیادہ خطرناک تھا جس کی

اگر چوہدری کی نظر پڑ جاتی تو یہ بم پھٹ جاتا اور محبوب صاحب کا...... نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔

اپنے رہائشی کمرے میں آ کے ندیم نے صراحی سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور دھڑام سے چارپائی پر گر گیا۔ پھر اس نے دہکتے جوان جسم کی ریشمی گہرائیوں سے نکالے جانے والے پرچے کو پڑھا۔ سیاہی کچھ پھیل گئی تھی مگر مضمون خود چوہدرائن کے لہجے میں بولتا تھا "چوہدری کل مقدمے کے سلسلے میں شہر جا رہا ہے۔ تین دن وہیں رہے گا۔ میں پیچھے والی کھڑکی کھلی رکھوں گی۔ تم نہ آئے تو کل میں خود پہنچ جاؤں گی تمہارے پاس۔"

سوچ سوچ کے ندیم کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اسے ڈاکٹر امجد کی نصیحت یاد آئی کہ کسی عورت کے چکر میں مت پڑنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔ ندیم نے تسلیم کیا کہ وہ معاملاتِ عشق میں بزدل، نامرد بلکہ اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ اب وہ کیا کرے، نہ جائے تو مصیبت، ٹھکرائی ہوئی عورت زخم خوردہ ناگن سے زیادہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ جائے تو گویا جان سے جائے، جہاں سے جائے۔ وہ عورت اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی بھی نہیں ہے۔ وہ پھر بلائے گی۔ بیماری کے بہانے کرے گی اور اس سے کچھ بعید نہیں کہ جس رات چوہدری گھر پر نہ ہو وہ اپنی خواب گاہ کی کھڑکی سے نکلے اور اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدھی ندیم کے بستر میں آ گھسے...... "یا میرے مولا، میری جان بچا۔ میں یہاں حرام موت مرنے نہیں آیا تھا۔"

وہ پتلون اور جوتوں سمیت بستر پر دراز آنکھیں کھولے چھت کو گھورتا رہا اور پرچہ چوہدری کے حوالے کرنے سے نوکری چھوڑ کر بھاگ جانے تک تمام امکانات پر غور فرماتا رہا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب نیم غنودگی میں اس نے ایک پُراذیت چیخ سنی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے اور آنکھیں کھل گئیں۔ رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک درد بھری فریاد اس کی سماعت سے ٹکرائی "ہائے...... ہائے میں مر گیا۔ اوئے مینوں نہ مارو ظالمو! اوئے تواں نوں رسول دا واسطہ، ہائے...... آہ!"

یہ آخری آہ ایک ہولناک آخری چیخ تھی جو شاید موت کی وادی میں صدائے بازگشت کی طرح گم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بے حس رات کا وہی سفاک سناٹا۔ زمین کی چھ فٹ گہرائی میں قبر کا جکڑ لینے والا جمود۔ اور یوم حساب کی خبر دینے والے صور اسرافیل کا خاموش لامتناہی انتظار۔

ندیم کو اچانک ہوش آ گیا۔ اس نے میز پر سے ٹارچ اٹھائی اور باہر کی طرف لپکا۔ اندھیری رات کے بیکراں سناٹے میں اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ افق کے تاریک کینوس پر ستاروں کی بے نام روشنی کے پس منظر میں درخت کسی عفریت کی طرح بانہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ اس کے سامنے مختصر سے میدان کے بعد کھیتوں کا تاحدِ نظر پھیلا ہوا سلسلہ تھا اور پیچھے گاؤں کی آبادی کے اندھیرے گھر تھے۔ کہیں کوئی حرکت نہیں تھی۔ کوئی آواز نہیں تھی مگر جو کچھ اس کے کانوں نے سنا وہ بے وجود واہمہ نہیں تھا۔ فریب خیال نہیں تھا۔ وہ پلٹ کے اندر گیا اور اپنا ریوالور اٹھا لیا۔ پھر وہ برآمدے سے اترا اور اندازے سے آواز کی سمت چلنے لگا۔

ایک آواز پر اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ یہ آواز بہت واضح تھی۔ جیسے کسی نے زمین کے سینے پر کوئی بوجھ پھینکا ہو۔ کوئی وار کیا ہو۔

دھم دھم کی آواز پھر سنائی دی۔ خاموشی میں کسی نے صاف مگر بارعب آواز میں گالی دے کے کہا "جلدی ہاتھ چلا......" جواب میں کسی نے دبے دبے لہجے میں کچھ کہا جو ندیم کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر دو افراد آپس میں بات کرنے لگے۔ اندھیرے میں ماچس کی تیلی کا ایک ننھا سا شعلہ روشن ہوا اور ندیم نے دو سائے سے دیکھے۔ پھر شعلہ بجھ گیا اور ایک سلگتی سگریٹ کی چنگاری روشن ہونے لگی۔ ندیم آگے بڑھتا گیا۔ جب وہ بالکل قریب پہنچ گیا تو کوئی اسے چونک کے کہا "کون ہے۔"

ندیم نے ٹارچ روشن کی اور اس کے دائرے کو اپنے سامنے چند گز کے فاصلے پر مرتکز کر دیا۔ روشنی ایک محدود حلقے میں گھوم کے ایک خستہ حال لہو آلودہ شکستہ تن پر ٹھہر گئی۔ لاش سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شخص صرف لنگوٹ باندھے زمین پر گڑھا کھودنے کے لیے بیلچہ لیے کھڑا تھا۔

دو افراد تیزی سے ندیم کی طرف بڑھے "اوئے...... کون ہے تو؟"

ندیم نے بڑی کوشش سے خود کو پُرسکون رکھا اور ٹارچ کی روشنی ان دونوں کے چہروں پر ڈالی "میں ڈاکٹر امجد ہوں۔"

تیز چندھیا دینے والی روشنی نے آگے بڑھنے والوں کو ایک ہاتھ آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے رکنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں وہ روایتی اسلحہ تھا جس سے انہوں نے ایک جیتے جاگتے انسان کو دم بدم سرد پڑتی اکڑتی لاش میں تبدیل کر دیا تھا۔ ندیم نے ان کی شکلیں پہلے نہیں دیکھی تھیں مگر وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ خونخوار اور بدمعاش نظر آنے والے وہ دونوں قاتل اسی گاؤں کے رہنے والے ہوں گے۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو ڈاکٹر بابو" ایک نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر اور آواز کو ڈرامائی انداز میں خطرناک بنا کے کہا۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا تھا؟" ندیم نے کہا۔

دوسرے شخص نے چمکدار پھل والی کلہاڑی کندھے پر رکھ لی" جاؤ ڈاکٹر صاحب! اپنا کام کرو، چلے جاؤ ادھر سے۔"

"ہم بھی اپنا کام کر کے چلے جائیں گے" پہلے والے نے کہا جس نے لوہے کے دستے اور مٹھ والی لاٹھی پکڑ رکھی تھی۔

ندیم نے مضبوط لہجے میں کہا "کون ہے یہ جسے تم قتل کر کے یہاں گاڑ رہے ہو؟"

لاٹھی والا فلمی ولن کی طرح دھاڑا۔ "اوئے ڈاکٹر۔ فالتو سوال مت کر۔"

کلہاڑی والا خطرناک انداز میں ایک قدم آگے آیا "خیریت اسی میں ہے ڈاکٹر صاحب کہ الٹے قدم واپس چلے جاؤ اور اپنے بستر پر جا کے سو جاؤ۔ بھول جاؤ کہ تم نے کچھ دیکھا یا سنا تھا۔"

"ورنہ ہم تجھے بھی اس کے ساتھ سلا دیں گے" لاٹھی والا زیادہ جاہل اور آتش مزاج تھا۔

ندیم نے اپنی طبعی بزدلی کو خیرباد کہتے ہوئے دھاڑ کے کہا "بند کرو یہ فضول بکواس۔ میں تم دونوں کو چھوڑوں گا نہیں۔"

"کیا کرے گا تو......" لاٹھی والے نے ندیم کو ایک گالی دی اور اس کے مقابل آ گیا۔

ندیم مضبوطی سے اپنے قدم جمائے کھڑا رہا "میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا، تم دونوں قاتل ہو۔"

کلہاڑی والا ایک جست لگا کے آگے بڑھا اور اس نے ندیم کو زور سے دھکا دیا۔ ندیم نیچے جا پڑا۔ اس کے ہاتھوں میں کانٹے سے چبھ گئے۔ کلہاڑی والے نے اسے ڈرانے کے لیے قاتلانہ انداز میں اپنی کلہاڑی بلند کی۔ لاٹھی والے نے اسے روک دیا۔

"چل اٹھ اور دفع ہو جا ادھر سے...... اور اپنی زبان بند رکھنا، بھونکنے کی کوشش کی تو کتے کی موت مارا جائے گا۔" اس نے ندیم کی گردن دبوچ کے ایک جھٹکا دیا۔

ندیم گردن چھڑا کے تیزی سے اٹھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کے اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور ان کے سروں کے اوپر ہوائی فائر کر دیا۔ اس کے لبوں پر عالم غیظ و غضب میں خود بخود شاندار گالیاں آ [illegible]

"رک جاؤ اپنی جگہ پر، تمہاری تو......"

مگر وہ ایک دم بدحواس ہو کے پلٹے اور سرپٹ بھاگے۔ قبر کھودنے والا چند سیکنڈ کے فرق کے باعث ان سے چند قدم آگے تھا۔ ندیم کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی کا رخ بھاگنے والوں کی طرف کیا اور انہیں اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ اسے پورا اعتماد تھا کہ ان تین صورتوں کو وہ پھر کہیں بھی دیکھے گا، پہچان لے گا۔

چند لمبے گہرے سانس لے کر ندیم نے خود کو پُرسکون کرنے کی واجبی سی کوشش کی اور پھر ٹارچ کی روشنی میں قریب جا کے لاش کا جائزہ لیا۔ وہ شاید چالیس پینتالیس سال کا بوڑھا ہو گا مگر غربت اور سختی، حالات یہاں پست ترین سطح پر زندگی گزارنے والوں کے لیے وقت کی رفتار بڑھا دیتی تھی۔ عورتیں پچیس سال میں نصف درجن بچوں کی ماں اور پینتیس سال میں دادی بن کے بوڑھی نظر آنے لگتی تھیں۔ چالیس سال کا مفلس ساٹھ ستر سال کا بڈھا لگتا تھا۔ کچھ ایسی ہی حالت مرنے والے کی تھی جو بے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات، کی عملی تصویر عبرت نظر آتا تھا۔ اس کی خون آلود داڑھی کے زیادہ تر بال سفید تھے۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا۔ ایک آنکھ حلقے سے باہر نکل آئی تھی اور اس سے خون رس کر مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ شاید لاٹھی نے اس کی ہڈیاں توڑ دی ہوں گی مگر اس کا کام کلہاڑی کے وار نے تمام کیا تھا۔

ندیم پر اب اشتعال سے زیادہ پریشانی اور خوف غالب آنے لگا تھا۔ اس نے قتل ہوتے تو نہیں دیکھا تھا مگر اس نے قاتلوں کو دیکھا تھا اور وہ انہیں پہچان بھی سکتا تھا۔ باقی کام پولیس کا تھا کہ وہ قتل کے اسباب کا سراغ لگائے اور قاتلوں کو گرفتار کر کے کیفرِ کردار تک پہنچائے۔

وہ اس قسم کی صورت حال سے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ سنگین نوعیت کے جرائم میں شہر والے چشم دید گواہ بھی جائے واردات سے بھاگ جاتے تھے اور قانونی پریشانیوں سے بچنے کے لیے کوئی بھی تھانے کچہری کا رخ نہیں کرتا تھا لیکن یہاں صورت حالات مختلف تھی۔ اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اس لاش کو لاوارث سمجھ کے جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ جائے اور سب کچھ بھلا کے چین سے سو جائے۔ لاش کی ایک کھلی آنکھ اسے گھورتی اور یہ سوال کرتی محسوس ہوئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب! کیا تم بھی اندھے، گونگے اور بہرے بن جاؤ گے؟ تم بھی اپنے ضمیر کی آواز نہیں سنو گے؟ تم بھی اپنی اخلاقی اور قانونی ذمے داریوں کو مصلحت پر قربان کر دو گے؟

ندیم کے کانوں میں ابھی تک وہ چیخیں گونج رہی تھیں جو اندھیرے اور سکوت شب میں طویل فاصلہ طے کر کے اور اس کے بند کمرے کی دیواروں سے گزر کے اس کے کانوں میں اتر گئی تھیں۔ انہیں بھول جانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

بالآخر اس نے معاملے کو پولیس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چاہیں تو تفتیش کریں چاہیں تو معاملے کو دبا دیں۔ شہر میں بھی یہی ہوتا ہے۔ پولیس واقعات اور شہادت تو کیا قاتل اور مقتول تک کو بدل دیتی ہے۔ زبردست انصاف قانون' فرض اور ضمیر جیسی تصوراتی قدروں کو بھی لاوارث قرار دی جانے والی لاش کے ساتھ دفن کرا دیتا ہے۔ زبردست وہ ہوتا ہے جس کے پاس پیسے کی یا اثر ورسوخ کی طاقت ہو۔

طبعاً کم ہمت اور بزدل ہونے کے باوجود ندیم نے اس وقت اپنے وجود میں بے خوفی اور خود اعتمادی کو ہائی ٹینشن لائنوں میں سنسناتی بجلی کی طرح دوڑتا محسوس کیا۔ آخر اسے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ یہاں کے معززین میں شامل ہے۔ ایک ڈاکٹر ہے اور اسے چوہدری کی پشت پناہی حاصل ہے۔

تھانے دار سے اس کے اچھے مراسم تھے مگر اسے علم نہیں تھا کہ معشوق کی کمر کی طرح تھانہ...... کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے۔ اس کے جغرافیائی علم کے مطابق ساجن پور سے تھانے کا فاصلہ تین کوس کی مسافت تھی۔ ظاہر ہے رات کے اندھیرے میں وہ اکیلا اور پیدل یہ فاصلہ طے نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے کسی سواری کے حصول کے امکانات پر غور شروع کیا۔ گاؤں کی سب سے برق رفتار ٹیکسی یعنی تانگا اس وقت کون اسمبل کرتا۔ اس کی باڈی کسی دونالی والی اینٹی ائرکرافٹ گن کی طرح اپنا رخ آسمان کی طرف کیے کھڑی ہوگی اور انجن گھاس کھا رہا ہوگا۔ دیگر ذرائع آمدورفت میں بیل گاڑی تھی یا براہ راست گدھے کی سواری تھی۔

پھر اسے سائیکل کا خیال آیا اور اس نے اپنے معاون خصوصی مسٹر نون سے نذیر کی مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی سرکاری رہائش گاہ یعنی رہنے کا گھر بھی آدھا کلومیٹر ضرور تھا۔ یہ راستہ بھی اس وقت سو فیصد محفوظ نہیں تھا۔ اس پر کم سے کم ایک درجن بھونکنے والے اور اتنے ہی کاٹنے والے کتے کسی بھی مشکوک اجنبی کو خوش آمدید کہنے کے لیے مستعد پھرتے تھے۔

چلتے چلتے ندیم نے اپنا موبائل فون جیب میں ڈال لیا' کسی بھی ہنگامی صورت میں شہر سے مدد طلب کرنے کے لیے یہ اس کا واحد مواصلاتی ذریعہ تھا۔ اس نے کتوں کی یلغار کے امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے تین فٹ لمبا بانس کا ٹکڑا بھی اٹھا لیا حالانکہ اس دفاعی ہتھیار کی کارکردگی کی افادیت مشکوک تھی۔

آدھا کلومیٹر تک اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا اور بے سبب جارحانہ عزائم کا اظہار کرنے والے کتوں کے سامنے بانس کو شمشیر آبدار کی طرح لہراتا بالآخر وہ نون سے نذیر کے گھر پہنچ گیا۔ یہ گھر خالص دیہی طرز تعمیر کا غریبانہ نمونہ تھا۔ پیچھے دو کچے کمرے' سامنے وسیع صحن جس کے گرد ایک کچی دیوار پر گوبر کے اپلے تاکوں کی طرح جڑے ہوئے تھے اور بغیر منڈیر کی ایک چھت جس پر چڑھنے کے لیے زینہ نہیں تھا۔ اس گھر میں بھی نذیر کے ماں باپ' بھائی بہن اور چاچے چاچی کی اولادوں سمیت پندرہ بیس افراد اتنی ہی پرمسرت اور مطمئن زندگی گزارتے تھے جتنے ان کے مویشی۔

عین دروازے پر' جو احاطے کی دیوار میں چھوڑے جانے والے چھ آٹھ فٹ کے خلا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ دو افراد منجی ڈالے سو رہے تھے اور مقابلے کے انداز میں خراٹے ایک دوسرے کے کان میں براہِ راست نشر کر رہے تھے۔

باہر سے چہاردیواری کے اندر سونے والوں کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہاں درجن بھر چارپائیوں پر ہر عمر اور سائز کے حضرات و خواتین' بچے بوڑھے اسی طرح ڈھیلی کشتی نما چارپائیوں پر یک جان دو قالب ہوئے پڑے تھے۔ یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ ان میں سے کون ہے جو نون سے نذیر ہے اور کون نون سے نسیمہ۔ ندیم کی یہ مشکل اللہ نے یوں آسان کی کہ اچانک در خاص پر بے سدھ سونے والوں میں سے ایک کے خراٹے بند ہو گئے۔ پھر اس نے کچھ ٹھنڈ محسوس کرتے ہوئے چادر اوڑھنے کی ضرورت محسوس کی اور چادر دستیاب نہ ہونے کے باعث اپنے نائٹ سوٹ یعنی دھوتی کو مقامی دستور کے مطابق بطور چادر سر سے پیر تک اوڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ندیم پر انکشاف ہوا کہ وہی اس کا معاون خصوصی یعنی نون سے نذیر ہے۔

اس نے آہستہ سے نذیر کو آواز دی ''نذیر......!''

نذیر ہڑبڑا کے اٹھا ''ڈاکٹر صاحب!...... آپ......؟''

ندیم نے اسے خاموش رہنے اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تو نون سے نذیر نے بے تن رہ جانے والی چادر کو پھر جسم کے زیریں حصے پر دھوتی بنا کے باندھا اور ندیم کے پیچھے چل پڑا۔ ''میں تو ڈر گیا تھا ڈاکٹر صاحب! خیر تو ہے؟''

''نہیں' خیر نہیں ہے'' ندیم پچاس قدم چل کے رک گیا ''یہ بتاؤ' تمہارے پاس سائیکل ہے؟''

نذیر نے نفی میں سر ہلایا ''سائیکل پر کہاں جانا تھا اس وقت' لاہور؟''

''بے وقوف!'' ندیم نے اسے ڈانٹا ''تھانے جانا تھا۔''

نذیر کی گھگھی بندھ گئی ''تھا...... تھانے۔ معاملہ کیا ہے جی؟''

ندیم نے اس سوال کا جواب نہیں دیا ''یہ بتاؤ کسی کی سائیکل لے سکتے ہو؟''

''ہاں جی'' نذیر سوچ کے بولا ''آؤ میرے ساتھ۔''

مختصر سا فاصلہ طے کر کے وہ ایک اور گھر تک پہنچے جہاں دھوتی کسنے کے بعد نون سے نذیر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پلک جھپکنے میں ایک دیوار پھاند کے غائب ہو گیا۔ دو منٹ بعد دیوار کے اوپر ایک سائیکل نمودار ہوئی جسے دو ہاتھوں نے بلند کیا ہوا تھا ''پکڑو صاحب'' نذیر کی پھنسی پھنسی آواز آئی۔

ندیم کے لیے دیوار کے اوپر سے سائیکل پکڑنے کے سوا چارہ نہ رہا ''یہ تم نے کیا' کیا؟'' وہ نذیر کے باہر آنے کے بعد بولا ''میں نے سائیکل چوری کرنے کے لیے تو نہیں کہا تھا؟''

نذیر نے سادگی سے کہا ''چوری کب کی ہے ہم نے۔ واپس آ کے پھر اسی جگہ رکھ دیں گے۔ ویسے بھی اپنا یار ہے فیکا۔''

''یار ہے تو اسے جگا کے سائیکل لے لیتے؟''

''چھوڑو جی! اس کی نیند خراب ہوتی۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے اس کی۔ یہ سائیکل بھی جہیز میں ملی ہے۔ اس کی بیوی کبھی نہ دیتی' چلو آپ تشریف رکھو۔''

ندیم یعنی ڈاکٹر امجد نے تشریف کو سائیکل کے کیریئر پر رکھا اور اس کے معاون خصوصی نے گاڑی کے ڈرائیور کے فرائض سنبھال لیے۔ کچا راستہ گلیوں کے بعد پگڈنڈیوں سے گزرتا تھا۔ ہر جگہ گڑھے اتنے زیادہ تھے کہ ندیم پیچھے بیٹھا ہوا مسلسل تھرتھرا رہا تھا۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا۔ ایک بار ایک زیادہ مستقل مزاج کتا بھونکتا ہوا سائیکل کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا اور ڈاکٹر کی بائیں ٹانگ سے تین فٹ کے فاصلے پر آ گیا تو ندیم نے بانس کے ٹکڑے سے اس پر ایک ضرب مجاہد لگانے کی کوشش کی۔ کتا رک گیا مگر ندیم بھد سے خدا کی بنائی ہوئی زمین پر چت ہو گیا۔

اب سائیکل کے پائلٹ نے اسے زیادہ محفوظ مقام یعنی آگے ڈنڈے پر منتقل کر دیا۔ پیچھے والا کیریئر ویسے بھی ندیم کی تشریف کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا اور ہر جھٹکے پر دائیں بائیں جھولتا بھی تھا کیونکہ اس کے پیچ ڈھیلے تھے۔

بالآخر ندیم نے خود کو دو تاریک گلیوں پر مشتمل ...... کے سامنے پایا۔ ہانپتے ہوئے معاون خصوصی نے تصدیق کی کہ یہی تھانہ ہے۔ اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر ساجن پور جیسے ایک اور گاؤں کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک پولیس چوکی تھی مگر اس کا دبدبہ کسی پکے تھانے سے کم نہیں تھا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے'' ندیم نے مایوسی اور برہمی سے کہا۔

''ہوگا کیسے نہیں جی'' نذیر نے ایک دروازے پر ناکنگ کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں کوئی اندر سے اس شیر کی طرح دھاڑا جس کی دم پر سوتے میں کسی کمزور نگاہ والے گدھے نے پاؤں رکھ دیا ہو ''کون ہے اوئے......؟'' پھر دروازہ کھلا اور ایک شخص تقریباً اسی حلیے میں نمودار ہوا جس حلیے میں ندیم نے کچھ دیر پہلے اپنے معاون خصوصی کو دیکھا تھا۔ غصے میں وہ شخص کالے انجن کی طرح دھواں دیتا محسوس ہوتا تھا مگر نذیر نے بڑی بے خوفی سے کہا ''اپنے ڈاکٹر صاحب آئے ہیں...... تشریف لائے ہیں۔''

خواب خر...... گوش سے جاگنے والے مشتعل کانسٹیبل کا حال اس سوکھی لکڑی جیسا ہو گیا' جس کو پانی میں ڈبو دیا گیا ہو۔ ''ڈاکٹر صاحب! او جناب...... بسم اللہ...... خیر تو ہے؟'' وہ دروازے سے ہٹ گیا۔ پھر اس نے ڈاکٹر صاحب کو کمرے میں موجود واحد کرسی بیٹھنے کے لیے پیش کی۔ نذیر اس چارپائی پر بیٹھ گیا جس پر کانسٹیبل سو رہا تھا۔ کانسٹیبل نے روشنی کے لیے لالٹین کی وِک بڑھا دی۔

''حوالدار...... میرا مطلب ہے تھانے دار۔ کریم بخش کہاں ہے؟''

''وہ......'' پریشانی سے کانسٹیبل کا برا حال ہو گیا ''گشت پر ہوں گے جناب...... یا ڈیرے پر۔''

''جاؤ' اسے بلا کے لاؤ' فاسٹ'' ندیم نے اپنے لہجے میں حاکمانہ تمکنت کا اضافہ کیا ''باہر سائیکل رکھی ہے ہماری' وہ لے جاؤ۔''

کانسٹیبل نے بلاچوں وچرا تعمیل کی۔ اس نے لباس کا بالائی حصہ پہننے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا اور سائیکل لے کر روانہ ہو گیا۔

اصلی تے وڈا تھانے دار بھی اسی ٹیکسی سے اترا جس پر سوار ہو کے ندیم یہاں پہنچا تھا تو اس کے چہرے پر خواب خر + گوش سے جگائے جانے کی بے کیفی سے زیادہ یوں طلب کیے جانے کی برہمی تھی۔ ندیم کو فوری طور پر سرکاری کرسی چھوڑنی

تھانے دار نے اس سے خاصی سرکاری سرد مہری کے ساتھ ہاتھ ملایا ''خیر تو ہے ڈاکٹر صاحب! اس وقت کیسے تکلیف کی؟'' جس کا اصل مطلب تھا کیوں تکلیف دی۔

ندیم نے خود کو چارپائی کی پٹی پر بیلنس کیا ''وہ دراصل معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔ ایک قتل ہو گیا ہے۔''

تھانے دار نے اپنی جیب سے نکال کے سگریٹ جلائی اور ایک کش لے کر کہا ''کس کا؟'' اس کا ردِعمل اتنا بے نیازانہ تھا جیسے ندیم نے کہا ہو کہ ایک درخت گر گیا ہے' نیم کا یا آم کا؟

''یہ تو مجھے نہیں معلوم'' ندیم نے کہا۔

تھانے دار کے لہجے میں برہمی آ گئی ''پھر آپ کیوں پریشان ہو؟''

ندیم نے بھی لہجہ سخت کر لیا ''اس لیے کہ یہ میرا بھی قانونی اور اخلاقی فرض ہے۔ یہ تھانہ اسی لیے بنایا گیا ہے اور یہاں آپ کو اسی لیے بٹھایا گیا ہے کہ کوئی جرم ہو تو اس کی رپورٹ آپ کو دی جائے۔''

تھانے دار کا رویہ ایک دم بدل گیا' وہ محتاط ہو گیا ''آپ نے قتل ہوتے دیکھا تھا؟''

''میں نے قاتلوں کو دیکھا تھا۔''

''پھر آپ نے انہیں پکڑا کیوں نہیں؟ اچھا تھا انہیں بھی اپنے ساتھ ہی لے آتے'' تھانے دار نے طنز اور تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

''وہ مسلح تھے۔ میں ان کا مقابلہ کرتا تو شاید وہ مجھے بھی قتل کر دیتے مگر وہ مجھے دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ وہ تین تھے' ان میں سے ایک لاش کو جنگل میں دبانے کے لیے گڑھا کھود رہا تھا'' ندیم نے کہا۔

ندیم کی پوری بات سنے بغیر تھانے دار نے اپنے ماتحت کو احکامات جاری کر دیے ''اوئے' تو جا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ' سائیکل لے جا۔''

ندیم نے کہا ''سائیکل میری نہیں ہے۔''

تھانے دار نے احکامات کا سلسلہ جاری رکھا ''یہ جو باہر بیٹھا ہے' اسے کہہ کہ گھر جائے' سائیکل پہنچ جائے گی۔ لاش کہاں ہے؟''

ندیم نے کہا ''وہیں ہو گی جنگل میں اور کہاں؟''

''او یار! جنگل تو یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔'' اس نے اپنے ایک ہاتھ کو نیم دائرے میں لہرایا ''ویسے ڈاکٹر صاحب! ایک بات بتاؤ' اتنی رات گئے آپ جنگل میں کیا کر رہے تھے؟''

ندیم نے تھانے دار کے ماتحت کو اس سوال پر معنی خیز انداز میں مسکراتے اور اپنے افسر اعلیٰ کی ذہانت پر تعریف کے انداز میں سراہتے دیکھا۔

''یہ واردات میرے گھر...... اسپتال کے قریب ہی ہوئی تھی۔ میں سو رہا تھا اور مقتول کی چیخ پکار سن کے باہر نکلا تھا۔''

تھانے دار نے مشکوک لہجے میں کہا ''کوئی اور بات تو نہیں ہے؟''

اس خالص تفتیشی انداز کے سوال نے ندیم کو بہت جز بز کیا ''اور کسی بات کا کیا مطلب ہے آخر۔ قتل خود میں نے کیا ہے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے خود ہی رپورٹ درج کرانے آ گیا ہوں؟''

تھانے دار مسکرانے لگا ''آپ تو ایویں ناراض ہو رہے ہو ڈاکٹر صاحب! ابھی میں نے رپورٹ کہاں درج کی ہے۔''

''مجھے رپورٹ درج کرانی بھی نہیں ہے۔ میرا کام تھا آپ کو مطلع کرنا۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام'' ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔

تھانے دار نے محسوس نہ ہونے والی مگر الفاظ میں چھپی ہوئی دھمکی کو نوٹ کر لیا ''آپ فکر مت کرو جناب! ہم اپنی ذمے داری جانتے ہیں۔ اوئے کریم بخش! تجھ سے کیا کہا تھا میں نے۔ اپنے ڈاکٹر صاحب کو سائیکل پر بٹھا کے ساتھ لے جا۔ پھر دیکھ لاش کہاں پڑی ہے۔ اگر اپنا تھانہ لگتا ہے تو اسے سائیکل پر ڈال کے لے جا۔ ا[illegible] کے پار ڈال آ۔ پھر فٹافٹ واپس آ اور اس بندے کو جس کی یہ سائیکل ہے' اسے کہہ دے صبح تھانے آ کے سائیکل لے جائے۔''

ندیم یہ سب حیرانی سے سنتا رہا ''اسی کو کہتے ہیں آپ ذمے داری؟ لاش ساجن پور کے کسی بندے کی ہے۔ آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ کون تھا۔ کیوں مارا گیا اور اسے کس نے مارا؟''

''دیکھو جی ڈاکٹر صاحب! آپ ہمیں یہ سب مت سمجھاؤ۔ ہم نے کبھی آپ کے کام میں دخل دیا ہے؟ یہ کہا ہے کہ فلاں مریض کا علاج ایسے کرو۔ آپ نے لاش کا بتا دیا' اب آپ جاؤ۔''

ندیم نے جیب سے موبائل فون نکال لیا ''آپ کو معلوم ہے یہ کیا چیز ہے؟ اسے موبائل فون کہتے ہیں اور اس کی میموری میں ڈیڑھ سو نمبر ہیں۔ ان میں ایک ڈی ایس پی قمر الزماں کا بھی ہے۔ اگر میں صرف ایک بٹن دبا دوں تو گھنٹی ڈی ایس پی کے گھر میں بجے گی۔''

تھانے دار کی حالت غیر ہونے لگی ''ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

"وہ بھی معلوم ہو جائے گا تمہیں۔ پھر اس کیس کی تفتیش تم نہیں کرو گے لیکن ان کے سامنے میرا بیان وہی ہوگا جو تمہارے سامنے تھا۔ میں ایک واردات کا واحد گواہ ہوں۔ اپنے بیان میں اگر میں نے اس گفتگو کو بھی شامل کر دیا جو ابھی میرے اور تمہارے درمیان ہوئی ہے تو......"

تھانے دار نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اٹھ کھڑا ہوا "اچھا سر جی! غلطی معاف...... میں چلتا ہوں تفتیش کے لیے آپ کے ساتھ۔"

باہر نکل کر ندیم نے اپنے معاون خصوصی کو آنکھ مار کے کہا "نذیر تم جاؤ' اپنی سائیکل لے کر۔ میں آ رہا ہوں تھانے دار صاحب کے ساتھ۔"

تھانے دار اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا "پھر ہم کیسے جائیں گے۔"

"ہم پیدل جائیں گے تھانے دار صاحب!" ندیم نے خوش دلی سے کہا "فاصلہ اتنا زیادہ تو نہیں ہے۔ گھنٹے بھر میں پہنچ جائیں گے۔"

لیکن سخت گھبرائے ہوئے نون سے نذیر نے جو مستقبل کے خدشات کو سمجھتا تھا' اس مسئلے کا حل فوراً پیش کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو آگے بٹھایا اور تھانے دار کو پیچھے۔ پھر اپنے جوان جسم کی دگنی طاقت صرف کر کے وہ اس وی آئی پی ایکسپریس کو منزل مقصود تک لے گیا۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ کچے راستے پر کہیں ٹائر بھی پنکچر نہیں ہوا اور رات کے آخری پہر میں انہیں کتے بھی لذت خواب سحر میں ڈوبے ہوئے ملے۔

لیکن ندیم کے دماغ کو چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ اس وقت لگا جب اس نے اپنے اندازے کے مطابق بالکل صحیح جگہ پہنچ کر ٹارچ روشن کی مگر اسے لاش نظر نہ آئی۔ اس کے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اس نے اندازے میں غلطی کی اور یہ لاش کی لوکیشن نہیں تھی۔ اس نے تیز روشنی کے دائرے کو ادھر ادھر گھما کے دیکھا۔ لاش کہیں بھی نہیں تھی۔

ندیم میں تھانے دار کی شرمندہ کرنے والی' پر تمسخر اور غصہ ور نظروں کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ "لاش...... یہیں تھی۔"

"تھی کا کیا مطلب جناب! سامنے ہے' صاف نظر آ رہی ہے۔ آپ ڈی ایس پی قمر الزماں صاحب کو بلا لو۔ وہ بھی دیکھ لیں" تھانے دار نے طنز کا بھرپور وار کیا۔

ندیم کی پوزیشن اپنے معاون خصوصی کی موجودگی میں سخت خراب ہو رہی تھی "تھانے دار صاحب! میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں' لاش اسی جگہ تھی۔"

"تھی تو پھر کہاں گئی؟ کیا خود ہی اٹھ کے قبرستان چلی گئی' کسی قبر میں لیٹ گئی؟" تھانے دار چلا کے بولا۔

"خواہ مخواہ چلانے کی ضرورت نہیں" ندیم نے برہمی سے کہا "میں نے خواب نہیں دیکھا تھا اور نہ میں نشے میں تھا کہ آدھی رات کو خوار ہوتا تھانے گیا۔"

تھانے دار کا لہجہ نارمل ہو گیا "خوار تو مجھے کیا آپ نے ڈاکٹر صاحب!"

"تم بھی تھانے دار ہو۔ دس بیس سال کی نوکری تو ضرور کی ہو گی پولیس کے محکمے میں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ لاشیں کیسے غائب ہوتی ہیں؟ قاتلوں کی بات تو چھوڑو' تم خود اسی چکر میں تھے کہ لاش کو جائے واردات سے اٹھوا کے سڑک کے پار کسی دوسرے تھانے کی حدود میں ڈال دیا جائے۔"

"آپ کا مطلب ہے لاش کو قاتلوں نے غائب کر دیا؟" تھانے دار نے بے وقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ کیا پتا گاؤں میں کسی کو لاشیں جمع کرنے کا شوق ہو۔ اسے خلائی مخلوق لے گئی ہو یا کوئی آدم خور شیر سالم نگل گیا ہو۔ یہ سب معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ......"

تھانے دار ایک دم جلال میں آیا اور سارا رکھ رکھاؤ بھول کر دہاڑا "میں کہتا ہوں' بکواس مارتے ہو تم۔ جھوٹ بولا ہے تم نے۔ مذاق کیا ہے قانون کے ساتھ۔ نہ یہاں لاش تھی' نہ ہے۔ تم نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ایک بندہ قبر کھود رہا تھا۔ کدھر ہے وہ قبر......؟ اچھی طرح دیکھ لو ہر طرف اور پھر مجھے بتاؤ' کہیں تازہ قبر کھدی ہوئی ہے۔"

ندیم کو اپنی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا۔ کیا وہ سب جو اس نے سنا اور دیکھا' فریب خیال تھا؟ جن بھوت کا تماشا تھا یا خواب تھا جسے اس نے حقیقت سمجھ لیا تھا۔

☆☆☆

ندیم سخت جھلایا ہوا تھا۔ غصہ اسے اپنے آپ پر آ رہا تھا۔ آخر کیا ضرورت تھی اسے اس بکھیڑے میں پڑنے کی۔ معلوم نہیں مرنے والا کون تھا؟ مارنے والے کون تھے اور اس شخص کا وجود ان کے کون سے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ موت تو ایسے ہی بہانے ڈھونڈتی ہے۔ بڈھا آدمی پچاس ساٹھ برس تو جی چکا تھا اور کتنے دن جیتا۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ وہ بلاوجہ آدھی رات کو خوار ہوا۔ اگر قتل کی رپورٹ لکھ لی جاتی تب بھی کیا ہوتا۔ کیا قاتل پکڑے جاتے؟ کیا کسی کو سزا ہوتی؟ نہ ہوتی نہ

شہادت' حساب پاک ہوا۔ یہ خون خاک نشیناں تھا' رزق خاک ہوا۔ وہ کون سا اس کا چاچا ماما لگتا تھا' جس کی خاطر وہ آدھی رات کو قانون اور انصاف کا دعوے دار بن کے نکل کھڑا ہوا۔ شہر میں لوگ سگے بھائی کو قتل ہوتا دیکھ لیتے ہیں تو نظر چرا کے گزر جاتے ہیں۔ تھانے کچہری کے چکر میں پڑنے کی کسے فرصت ہے اور کس میں ہمت ہے۔ قاتل بھاگ گئے تھے تو وہ بھی ٹھنڈے دماغ سے کام لیتا اور اپنے کمرے میں آ کے سو جاتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خواہ مخواہ کی دوڑ دھوپ سے شرمندگی کے سوا حاصل کیا ہوا؟ بڈھے کی لاش دبا دی جاتی۔ اب بھی تو دبا دی گئی۔ یہاں نہ سہی' وہاں...... ایک جگہ وہ پاگل کا بچہ ڈاکٹر آ گیا تھا پنگا لینے۔

لیکن ان تمام دلائل کے باوجود جو آج کی دنیا میں "جیو اور جینے دو" کا فلسفہ بن گئے تھے' اس مقتول بوڑھے کا چہرہ تھا جو ندیم کی نظروں کے سامنے سے ہٹتا نہیں تھا۔ اس کی ایک کھلی آنکھ' اس کا کلہاڑی کے وار سے دو حصوں میں بٹ جانے والا سر اور اس کا خون جو مٹی کا رنگ بھی لال کر رہا تھا۔ یہ سب ایک ایسے منظر کا حصہ تھے جو ندیم کے تصور کے پردے پر تصویر کی طرح ٹھہر گیا تھا۔

جسمانی تھکن سے زیادہ ندیم پر ذہنی شکست خوردگی کی تھکن اور فرسٹریشن غالب تھی۔ وہ صبح سے دو بار اپنے معاون خصوصی کو ایسی حماقتوں پر ڈانٹ چکا تھا جو اس کی فطرت اور مزاج کے مطابق تھیں۔ پھر ایک خبطی قسم کا اعصابی مریض آ گیا۔ اس کے تمام امراض کی جڑ اس کی بدشکل' بدزبان اور بداطوار، وزن اور حجم میں اس سے تین گنا بیوی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے مریض کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چلانے لگی۔ "رات' رات بھر سوتا نہیں۔ حقہ گڑگڑاتا رہتا ہے۔ سوتا ہے تو خود حقے کی طرح خراٹے لیتا ہے۔ نیند میں بکواس کرتا ہے۔ ہر وقت کھانے کو مانگتا ہے۔ اس کا بس چلے تو مجھے کھا جائے۔"

مریض نے منمنا کے احتجاج کیا "میں بھینس کا گوشت نہیں کھاتا۔"

ندیم نے سیکورٹی یعنی نون سے نذیر کو طلب کیا اور عورت کو کمرے سے نکلوا دیا۔ اب مریض نے اپنے جملہ امراض رئیسہ وخبیثہ کا بیان شروع کیا۔ "ٹخنے میں گیس بھر جاتی ہے۔ پھر ایک بلبلہ سا اٹھتا ہے اور پاؤں کی نلی سے دل میں پہنچ جاتا ہے۔ گڑ دم سے آواز آتی ہے۔ جیسے حقے میں الٹی پھونک مارنے سے آتی ہے۔ گیس خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ آپ

ہو گیا ہو۔"

ندیم نے اسے ایک سکون آور گولی دے دی "یہ رات کو سوتے وقت کھا لیا کرو۔"

اس نے گولی کو مشکوک نظروں سے دیکھا "انگریزی دوا تو بڑی گرم ہوتی ہے۔"

ندیم نے بھنا کے کہا "فریج میں بیٹھ کے کھا لینا" پھر اسے خیال آیا کہ اس دیہاتی کے گھر میں ریفریجریٹر کہاں ہو گا "میرا مطلب ہے' سر پر برف کی سل رکھ لینا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "برف رات کو کہاں ملے گی؟"

"پھر ایسا کرو" ندیم نے گولی واپس لے لی "دسمبر میں آنا' جب ٹھنڈ سے ناک بہہ رہی ہو۔"

ایک اور مریض کو اس نے تین دن کی دوا دی "تین گولیاں روز' صبح' دوپہر اور شام۔"

اس نے نو گولیوں کو دیکھا "یہ سب میں کھاؤں' اکیلا۔"

ندیم نے چڑ کے کہا "نہیں' سب مل کے ایک ایک کھا لینا۔ گھر میں کتنے لوگ ہیں؟"

اس نے انگلیوں پر گن کے بتایا "گھر والی' چار منڈے' تین کڑیاں۔ بے بے' سب ملا کے گیارہ۔"

ندیم نے تین گولیاں اسے اور دے دیں "ایک اپنی ساس کو بھی دے دینا۔"

دوپہر کے بعد خود اس نے ایک سکون بخش گولی کھائی اور نون سے نذیر کو طلب کیا "تم نے کوئی نئی بات سنی گاؤں میں؟"

نذیر نے گھڑے جیسا سر ہلایا "خیر محمد کی بھوری بھینس نے کٹا دیا ہے۔"

ندیم نے ضبط سے کام لیا "الو کے ...... داماد۔ میرا مطلب تھا' گاؤں میں کوئی پچاس ساٹھ سال کا بڈھا پراسرار طور پر غائب ہوا تھا؟"

اس نے ذہن پر زور دے کر پراسرار گمشدگی کے واقعات کو یاد کیا "پچھلے مہینے بشیرے کا چاچا غائب ہوا تھا۔ ڈاکو لے گئے تھے اسے۔"

ندیم نے چلا کے اصل گالی دی "الو کے پٹھے۔ گزشتہ رات میں نے ایک بڈھے کی لاش دیکھی تھی۔ جسے قتل کیا گیا تھا' کلہاڑی سے۔ میں نے قاتلوں کو بھی دیکھا تھا۔ میری ان سے گرما گرمی بھی ہوئی تھی اور اگر پستول نہ ہوتا میرے پاس تو وہ مجھے بھی اس بڈھے کے ساتھ مار کے گاڑ دیتے۔ میں نے گولی چلائی تو وہ جان بچا کے بھاگ گئے مگر جتنی دیر میں ہم

تم گاؤں میں گھومتے پھرتے ہو۔ لوگوں سے ملتے ہو۔ پتا کرو وہ بڈھا کون تھا؟ کسی نہ کسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی گھر کا کوئی بندہ غائب ہے' کسی کا باپ یا چاچا ماما؟''

''میں گھر گھر جا کے پوچھ لوں گا جناب۔''

ندیم نے سر پر ہاتھ مارا ''بے وقوف! کسی سے کچھ پوچھنا نہیں ہے۔ بس لوگوں کی باتیں سنتے رہو۔ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ قاتلوں کو میں نے اچھی طرح لائٹ مار کے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے پہچانے جانے کے ڈر سے وہ روپوش ہو گئے ہوں مگر میں انہیں جب بھی دیکھوں گا' پہچان لوں گا۔ وہ کب تک چھپے رہیں گے۔''

''ہو سکتا ہے وہ آپ کی جان کے دشمن ہو جائیں ڈاکٹر صاحب!''

ندیم نے دراز میں سے ریوالور نکال کے اسے دکھایا ''میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں میری فکر مت کرو۔''

کلینک بند ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا کہ نون سے نذیر کا عنقریب ہونے والا اسر یک چشم سابق حوالدار اپنی تاریخی شکاری بندوق کے ساتھ نمودار ہوا۔ ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ سکون بخش گولی کھا چکا تھا۔ حوالدار ایک سنکی بڈھا تھا جس کے بارے میں یقین سے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دوسری جنگ عظیم میں شریک بھی تھا یا نہیں مگر وہ جنگ میں اپنی بے مثل بہادری کے قصے اتنے یقین کے ساتھ سناتا تھا کہ لگتا تھا اس کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو اتحادی افواج کے ہاتھوں جرمنی اور جاپان کو کبھی شکست نہ ہوتی۔ اس کی بے سروپا بکواس کو سننا اور برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا کیونکہ وہ واقعات کو ایسے گڈمڈ کرتا تھا جیسے کوئی پاگل یا شرابی باورچی قورمہ پکانے کی ترکیب بتاتے ہوئے کھیر کے اجزا بتانے لگے اور زردے کے نسخے میں بمبئی بریانی کا مسالا لکھوا دے۔

اپنے تقرری کے منتظر ہونہار داماد کے سر پر دستِ شفقت پھیر کے اس کا ہیر اسٹائل خراب کرنے کے بعد وہ بندوق کو دونوں گھٹنوں میں دبا کے کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی نئی بیماری کا ذکر کرنے لگا ''ڈاکٹر پتر۔ میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو۔''

ندیم نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں پیلی ہو رہی ہیں ''مجھے کچھ یرقان کے آثار نظر آتے ہیں۔''

وہ سر کو دائیں بائیں ہلانے لگا ''یہ وجہ نہیں ہے ڈاکٹر۔''

''پھر کیا وجہ ہے؟''

''میں نے آج ولایتی مرغی کا انڈا کھا لیا تھا۔ اس کی زردی کا رنگ آنکھوں میں اتر آیا ہے۔''

ندیم نے مسکرا کے کہا ''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

وہ خفا ہونے لگا ''تجھے کیا پتا ڈاکٹر! کل میں نے پان کھالیا تھا تو میری آنکھیں اتنی لال ہو گئی تھیں کہ لگتا تھا ساری پیک آنکھوں میں چلی گئی ہے۔ اس سے پہلے میں نے جامن کھائے تو آنکھیں جامنی ہو گئیں۔ کل دن میں میری گھر والی نے مولی کے پتوں اور پالک کا ساگ پکایا تو آنکھوں کا رنگ ایک دم ہرا ہو گیا تھا۔''

ندیم نے مزید بحث کو لاحاصل سمجھتے ہوئے اسے دوا دے دی مگر وہ اس کے بعد بھی رخصت نہیں ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں اپنے بہادرانہ کارنامے کی بالکل نئی اسٹوری بنا کے لایا تھا ''ابھی دوسری جنگ عظیم کی بات ہے۔ ہم ادھر قسطنطنیہ کے محاذ پر تھے۔''

''اسے آج کل استنبول کہتے ہیں۔''

''کہتے ہوں گے فرنگی۔ وہ تو مصر کو بھی اجپٹ کہتے ہیں'' وہ مزید خفا ہوا ''افریقا کا ایک ملک ہے انڈونیشیا۔ یہ اس کا دارالخلافہ ہے۔ لو جی' ہم بیٹھے تھے خندق میں۔ میں گا رہا تھا ہیر وارث شاہ۔ میرے ساتھ تھا انگریز کپتان۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ لو جی اتنے میں اچانک جاپانی جہاز آ گئے۔ سیکڑوں جہاز تھے جیسے ٹڈی دل' گولے ایسے برسنے لگے جیسے اولے۔ یہ آج کل کے جہاز تو آسمان سے بھی اوپر اڑتے ہیں۔ اس زمانے میں صرف اپنے علامہ اقبال صاحب کے شاہین کی پرواز بلند ہوتی تھی۔ جہاز تو اتنا بھی نہیں جاتے جتنا کبوتر۔ اور جب بم مارنے کے لیے غوطہ لگاتے تھے سر کے بالوں کو چھوتے ہوئے گزرتے تھے۔ ڈرائیور صاف نظر آتا تھا۔ لو جی ایک حرامی جرمن جہاز کے ڈرائیور نے مجھے تاڑ لیا۔ اس نے گولا پھینکتے ہوئے مجھے جاپانی میں ماں بہن کی گالیاں دیں۔''

ندیم سے ضبط نہ ہو سکا ''جرمن پائلٹ نے......؟''

غالباً حوالدار نے اس سوال کو احمقانہ سمجھ کے نظر انداز کیا ''ہاں جی۔ جواب میں خندق سے سر نکال کے میں نے اسے پنجابی میں ایسی شاندار گالیاں دیں کہ واہ جی واہ۔ اور پھر تھری ناٹ تھری سے نشانہ لے کے فائر کیا تو گولی نے پہلے جہاز کی باڈی میں سیٹ کے نیچے سوراخ کیا اور پھر سیٹ سے گزر کے......''

ندیم شاید کچھ دیر کے لیے اونگھ گیا تھا کیونکہ جب وہ جاگا تو حوالدار اپنی بے مثل بہادری کا دوسرا بے سروپا واقعہ بیان کر رہا تھا۔ ''لو جی' ہم اپنے سر پر رکھ لیتے تھے جھاڑیاں اور ساتھ ساتھ مل کے بیٹھ جاتے تھے۔ اوپر سے نہ بندہ نظر آتا تھا' نہ زمین۔ پوری رجمنٹ اوپر سے کسی جنگل کی طرح نظر آتی تھی۔ جہاں موقع دیکھا تھوڑا سا آگے بڑھ گئے۔ پورا جنگل رات بھر میں دو میل آگے نکل گیا یا دائیں بائیں ہو گیا۔ اسے کیموفلاج کہتے ہیں۔''

ندیم کا ذہن یکلخت مستعد ہو گیا ''ایک منٹ حوالدار جی' سر پر سجانے کے لیے یہ جھاڑیاں کہاں سے اکھاڑتے تھے آپ لوگ؟''

''لو جی' اِدھر اُدھر کے درختوں سے شاخیں توڑ لیتے تھے اور چھتری جیسی جھاڑیاں بنا لیتے تھے۔''

ندیم اٹھ کھڑا ہوا ''نذیر...... ذرا میرے ساتھ آ۔''

نذیر جو اپنے نامزد سسر کے شاندار ماضی کی داستانِ شجاعت بڑی عقیدت مندی کے ساتھ سننے پر مجبور تھا' اپنے باس کے حکم کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ وہ ندیم کے پیچھے دوڑا اور حوالدار پوری جنگی تیاری کے ساتھ کسی متوقع ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بندوق اٹھا کے اپنے داماد کے پیچھے لپکا۔

ندیم سیدھا وہاں گیا جہاں اس نے گزشتہ رات ایک لاش پڑی دیکھی تھی۔ جو کچھ اس کی آنکھیں رات کے اندھیرے میں نہ دیکھ سکی تھیں' وہ اسے دن کے اجالے میں واضح طور پر نظر آ گیا۔ درخت کے نیچے زمین یقیناً کھودی گئی تھی مگر بعد میں اسے بڑی صفائی سے برابر کر دیا گیا تھا۔ لاش اٹھانے کے لیے آنے والوں نے گڑھے کی نرم مٹی میں ادھر ادھر کے درختوں سے شاخیں توڑ کے اس طرح گھڑی کی تھیں کہ اصل جگہ غائب ہو گئی تھی۔ ندیم نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تھا تو اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی تھی جہاں تازہ کھدی ہوئی مٹی دکھائی دیتی۔ ہر طرف درخت تھے اور جھاڑیاں تھیں اور ایک جیسی سخت اور ہموار زمین تھی۔ سوکھے پتے اور خشک ٹہنیاں تھیں اور جھاڑ جھنکاڑ پھیلے ہوئے تھے۔

لیکن ندیم کی آنکھوں کو اصل دھوکا کسی اور وجہ سے ہوا تھا۔ لاش جس درخت کے قریب پڑی تھی' وہ شیشم کا ایک پرانا درخت تھا۔ ایسے درخت جنگل میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ دیکھنے میں یہ سب ایک جیسے ہی لگتے تھے لیکن اس درخت کی ایک خاص پہچان تھی جس سے چند فٹ کے فاصلے پر لاش کو دفنانے کے لیے گڑھا کھودا جا رہا تھا۔ اس کی نچلی شاخوں پر اور تنے پر لال نیلے پیلے ہر رنگ کے ربن اور کپڑے بندھے ہوئے تھے جن کا رنگ دھوپ اور بوسیدگی سے ماند پڑ گیا تھا۔ اسی پہچان کی بنا پر ندیم تھانے دار کو سیدھا وہاں لے گیا تھا جہاں اس کے یقین کے مطابق لاش ہونی چاہیے تھی مگر لاش غائب تھی اور آس پاس آثار بھی نہیں تھے کہ کہیں زمین کھود کے برابر کی گئی ہے۔ جہاں لاش تھی' وہاں خون کا ایک داغ بھی نہیں تھا۔

دراصل قاتل ندیم کی توقع سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوئے تھے۔ پہلے تو وہ جان بچا کے بھاگ گئے تھے مگر بعد میں خود انہیں اپنی بزدلی پر شرم آئی تھی۔ پکڑے جانے کے خوف نے انہیں مجبور کر دیا تھا یا کسی اور نے جس کے وہ محض آلۂ کار تھے۔ انہیں سمجھا کے اور ڈانٹ ڈپٹ کے واپس بھیجا تھا۔ انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ فرض شناس اور قانون پرست ڈاکٹر تھانے گیا ہے چنانچہ دو گھنٹے سے پہلے لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ انہوں نے اطمینان سے اپنا کام کیا۔ انہوں نے لاش اٹھائی' جانے سے پہلے انہوں نے زمین برابر کی اور اسے چھپانے کے لیے آس پاس کے درختوں سے بڑی بڑی شاخیں توڑ کے برابر کیے جانے والے گڑھے میں گاڑ کے اس جگہ کو غائب کر دیا جو تازہ کھدی ہونے کی وجہ سے فوراً پہچانی جاتی۔

لیکن انہوں نے اس سے بڑھ کر فنکاری یہ دکھائی کہ پیپل کے اس درخت پر سے سارے رنگین دھاگے اور ربن' سنہرے روپہلے گوٹے والے پرانے دوپٹے اور وہ رنگ برنگے کپڑے جو اس درخت کی پہچان تھے' قریب ہی دوسرے درخت پر باندھ دیے۔ یہ کام بڑی ذہانت کا تھا اور آسان نہیں تھا مگر انہیں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔

اب دن کا اجالا تھا۔ ندیم نے غور سے دیکھا تو سارے سراغ خود بخود سامنے آتے چلے گئے۔ اصل درخت کی شاخوں میں چند رنگین کپڑے اور چمک دار ربن باقی رہ گئے تھے جو زیادہ بلندی پر تھے یا گھنے پتوں میں چھپے ہوئے تھے اور قاتلوں کو بھی نظر نہیں آئے تھے۔ درخت کے نیچے کھدی ہوئی مٹی کو چھپانے کے لیے جو شاخیں درختوں سے توڑ کے کھڑی کی گئی تھیں' ان کے پتے بھی اب مرجھا چکے تھے اور آس پاس کے سرسبز و شاداب پودوں سے الگ دکھائی دیتے تھے۔

شاید یہ نظر فریب کھیل دکھانے والے قاتلوں کو یقین تھا کہ بفرض محال یہ ضدی ڈاکٹر زبردستی تھانے دار کو اپنے ساتھ لے آیا تو اسے لاش کیا اصل جگہ ہی نہیں ملے گی جہاں لاش پڑی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ان کی نظر اس دام ہمرنگ زمیں کو دیکھ ہی نہیں سکے گی جو انہوں نے اصل جگہ کو کیموفلاج کرنے کے لیے بچھایا تھا اور تھانے دار تو تھانے دار ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر پر گرم ہوگا کہ پاگل دے پتر' آدھی رات کو خود تو خوار

ہوا' مجھے بھی پریشان کیا۔ کدھر ہے وہ لاش۔ وہ ڈاکٹر کو جھاڑ لگائے گا کہ اتنی مت پیا کر اور تفتیش مکمل کر کے ایک بار چلا گیا تو پھر ادھر لوٹ کے وقت برباد کرنے نہیں آئے گا۔

نہ یہ عقل وذہانت کو آزمانے والی جاسوسی ناولوں کی چویشن تھی اور نہ وہ شرلاک ہومز یا اس کے معاون ڈاکٹر واٹسن جیسے افسانوی کردار۔ صورت حال اتنی واضح اور عیاں تھی کہ سولہ جماعت پاس ندیم نے بھی اتنی ہی آسانی سے سمجھ لی جتنی آسانی سے پرائمری کی ڈگری رکھنے والے لون سے نذیر نے۔

ڈاکٹر کو کسی وجہ کے بغیر بدحواسی میں فرار ہوتے اور ماتحت کو اس کے نقشِ قدم پر دوڑتا دیکھ کے حوالدار کا پُرسکون بیٹھے رہنا ناممکن تھا۔ شاید اسے وہ وقت یاد آیا ہوگا جب کان کے قریب کسی بھونرے کی آواز سن کے بھی وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہوگا اور پناہ کے لیے خندق کی طرف دوڑتا ہوگا کہ جاپانی جہاز آ گئے۔

اب وہ کسی نامعلوم اور غیر موجود خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے بندوق کو فائر کرنے کی پوزیشن میں اٹھائے بڑی مستعدی سے ہر سو اپنی اُلو جیسی آنکھیں گھما رہا تھا ''خیر تو ہے ڈاکٹر پتر!''

ندیم نے اس کی عمر اور تجربے پر غور کیا ''حوالدار جی! کچھ عرصے پہلے اس درخت کے نیچے کوئی پیر سائیں یا ملنگ وغیرہ رہتا تھا؟''

لون سے نذیر نے اپنا سر فوراً ہلا دیا تھا مگر سوال نامزد سسر محترم سے کیا گیا تھا تو اس کا پہلے جواب دینے کی کوشش کرنا سراسر گستاخی کے مترادف تھا۔ حوالدار نے دامادی کے امیدوار کو ڈانٹا ''اوئے تجھے کیا پتا بے وقوف۔''

نذیر نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا ''یہ کوئی دوسری جنگ عظیم سے پہلے کی بات تو نہیں ہے۔''

حوالدار نے اس کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا ''کوئی سال بھر پہلے ...... دو سال ...... نہیں' دو سال پہلے تو شیرے پہلوان کو اس کے بہنوئی کے بیل نے ٹکر ماری تھی۔ کل ہی تو برسی تھی اس کی۔ یہ اس کے بعد کی بات ہے۔ ہاں خوب یاد آیا' اسی مہینے غفورے نائی کا بیاہ ہوا تھا اس سونی کمہارن سے۔ جس کے ساتھ وہ کھیتوں میں پکڑا گیا تھا۔ ابھی یاد آ جائے گی تاریخ بھی۔''

ندیم نے زچ ہو کے کہا ''دفع کریں تاریخ کو۔ صرف یہ بتا دیں کہ اس کا ڈیرا درخت کے نیچے تھا یا نہیں؟''

''ڈیرا تو تھا۔ ابھی چھ سات مہینے پہلے تک تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے آیا تھا' بابا طوطے والا کہلاتا تھا وہ۔ اس کے پاس ایک طوطا تھا۔ لوگ اپنا سوال لے کر بابا کے پاس آتے تھے مگر بابا صرف بات سنتا تھا۔ جواب اس کا طوطا دیتا تھا۔ ساری گالیاں آتی تھیں اسے۔ جتنا بڑا مسئلہ ہوتا تھا' اتنی ہی بڑی گالی دیتا تھا وہ سائل کو۔ ایک بار میری بکری کھو گئی تھی۔ میں بابا کے پاس گیا تو طوطے نے کہا۔ ''چل پھٹ ادھر سے الو کے پٹھے۔'' اور کمال دیکھو' بکری اسی درخت کے نیچے کھڑی ہوئی ملی جس پر ایک اُلو رہتا ہے۔ اپنے ساجن پور کے قبرستان کے راستے میں۔ روز رات کو اس کی آواز سنائی دیتی ہے'' حوالدار نے ایک ہاتھ کی مٹھی کو نلکی بنا کے منہ پر رکھا اور حیرت انگیز طور پر اُلو کی آواز نکالی۔

ندیم نے کہا ''گالی تو ٹھیک دی تھی طوطے نے ......''

''وہ بڑے نامراد سمجھے جاتے تھے جن سے طوطا کچھ نہ کہے'' ندیم کے معاون خصوصی نے وضاحت کی۔ ''ایک بار میں بھی گیا تھا اپنا سوال لے کر۔''

''مجھے معلوم ہے تمہارا سوال کیا ہوگا؟'' ندیم بولا ''مگر ......''

''طوطے نے مجھے ماں بہن کی گالیاں دیں'' نذیر نے کن انکھیوں سے اپنے سسر محترم کو دیکھا' جن کی نہ ایک طوطے کی گالیوں کے طفیل ہاں میں بدل گئی تھی ''سب مجھے مبارک باد دیتے رہے کہ تیرا کام تو ہو گیا سمجھ۔''

''یار' لعنت بھیجو طوطے پر'' ندیم جھلا کے بولا ''مجھے یہ بتاؤ کہ وہ بابا طوطے والا کس درخت کے نیچے بیٹھتا تھا؟''

حوالدار نے بڑے یقین کے ساتھ اصل درخت کی طرف اشارہ کیا اور پھر کچھ حیران ہو کے دوسرے درخت پر بندھے ہوئے رنگین کپڑوں کو دیکھا ''یہ حرامی پن کس نے کیا ہے؟''

ایک لمحے کے لیے ندیم کو یہ خیال آیا کہ وہ اس سارے قضیے کو فراموش کر دے لیکن تھانے دار کے گزشتہ رات کے پرتمسخر اور کسی حد تک توہین آمیز رویے کو یاد کر کے اس کے خون میں پھر ابال آ گیا۔ اس نے حق وانصاف کا پرچم بلند رکھنے کے لیے پھر تھانے کی راہِ پرصعوبت پر حوصلے کا صبر آزما سفر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

دن کے وقت ذرائع سفر کی دستیابی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے موڈ پر منحصر تھا کہ وہ گدھے اور گھوڑے سے بیل گاڑی یا تانگے تک کس قسم کی برق رفتار سواری کا انتخاب کرتے ہیں۔ لون سے نذیر کے تیور بھی صاف بتاتے تھے کہ دن دہاڑے کسی کی سائیکل چرا کے وہ اپنے باس کو ڈھونے کے موڈ میں نہیں ہے۔ یہ بہرحال اس کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں تھا۔

اپنے مرتبے اور سہولت کا خیال رکھتے ہوئے ندیم نے جاہ وجلال اکبری کے ساتھ حکم صادر کیا ''تانگا حاضر کیا جائے۔ مابدولت کوتوال کی سرکوبی کے لیے بقلم خود تھانے میں نزول اجلال فرمانا چاہتے ہیں۔''

وزیر باتدبیر لون سے نذیر نے تعمیل حکم کی۔ صرف آدھے گھنٹے میں ایک تانگا حاضر ہو گیا جس کے پائلٹ اور گھوڑے کی عمر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بسبب ناتوانی گھوڑا ابھی آدھے ہارس پاور کا رہ گیا تھا مگر اس دیسی ٹیکسی کو غنیمت جانتے ہوئے ندیم اس کے پچھلے حصے میں سوار ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے پھر داماد اینڈ سسر کی جوڑی سے رازدارانہ انداز میں کہا کہ وہ گاؤں سے پراسرار طور پر غائب ہو جانے والے کسی بوڑھے کے بارے میں معلومات حاصل کریں لیکن اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو۔

کچے راستے پر آنے کے بعد ندیم کو تانگے کے لنگڑانے کا احساس ہوا۔ اس نے غور سے گھوڑے کو دیکھا مگر اس کی چاروں ٹانگیں اور یجنل تھیں۔ گدھے گھوڑے کی ''کو پروڈکشن'' یعنی خچر میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ دو ٹانگیں گھوڑے کی ہوں اور دو خچر کی۔ فرق دونوں پہیوں کے سائز میں تھا۔ کوچبان نے اس کا ذمے دار گاؤں کے واحد تانگا انجینئر کو ٹھہرایا جو ورکشاپ میں مرمت کے لیے آنے والے تانگوں کے پہیے ادھر سے ادھر کر دیتا تھا۔ اس نے ندیم کو حوصلے سے کام لینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ کچھ دیر میں وہ ہچکی جیسے جھٹکوں کا عادی ہو جائے گا۔

آدھے راستے میں کمرشل بریک آ گیا۔ کوچبان نے ایک روڈ سائڈ اسٹور سے گھوڑے کے لیے لنچ خریدا۔ پھر محمود وایاز کی طرح تقریباً ایک ہی صف میں کھڑے ہو کے گھوڑے نے اور اس کے مالک نے پانی پیا اور خارج کیا۔ سفر کا اگلا مرحلہ تمام ہوا تو ندیم کو بیچ بیچ ہچکیاں آ رہی تھیں مگر وہ اپنی ساری کلفت اس وقت بھول گیا جب اس نے تھانے دار کو اپنی جائے مخصوص پر براجمان دیکھا۔ دیگر ایس ایچ اوز کی طرح اگر وہ بھی سرگشت پر ہوتا تو اسے نہ جانے کب تک تھانے کے لیبر روم میں اذیت برداشت کرنی پڑتی۔

ندیم کی شکل دیکھتے ہی تھانے دار کی صورت ایسے بگڑ گئی جیسے بے دھیانی میں کپ اٹھا کے وہ چائے کے ساتھ مکھی بھی نگل گیا ہو مگر ندیم بھی زیادہ جارحانہ عزائم کے ساتھ اس کے مقابل آیا تھا۔ کمرے میں موجود واحد کرسی پر خود تھانے دار براجمان تھا چنانچہ سخت گستاخانہ بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ندیم میز پر بیٹھ گیا۔

تھانے دار نے غرا کے کہا ''میز بیٹھنے کے لیے نہیں ہے۔''

ندیم نے بھی اسی لہجے میں غرا کے کہا ''پھر میں کیا کروں؟ فرش پر بیٹھ جاؤں یا تمہارے سامنے ملزموں کی طرح ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو جاؤں؟ میں ڈاکٹر اور گریڈ سترہ کا سرکاری افسر ہوں۔ تمہیں بات کرتے ہوئے بھی مجھے سر کہنا چاہیے اور مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو جانا چاہیے۔''

تھانے دار کی مٹی پلید ہو گئی تھی مگر اس کے لیے وہاں موجود ایک ملزم اور ایک ماتحت کے سامنے اس بے عزتی کے تلخ گھونٹ کو جام شیریں کی طرح پینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس نے ماتحت کو دھاڑ کے ایک مادری گالی سے نوازا اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنا اسٹول ڈاکٹر صاحب کو پیش کرے۔

''تم یقیناً سمجھ گئے ہو گے کہ میں دوبارہ یہاں کیوں آیا ہوں؟'' ندیم میز سے اتر کے اسٹول پر ٹک گیا۔

''کیا وہ غائب ہو جانے والی لاش مل گئی ہے؟'' تھانے دار نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

''اگر واپسی پر تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے آنگن میں بندھی ہوئی بھینس موجود نہیں ہے تو تم کیا کہو گے؟ بھینس غائب ہو گئی؟ جیسے بھوت غائب ہو جاتے ہیں۔ اور صبر کر کے بیٹھ جاؤ گے یا اسے تلاش کرو گے؟''

''کل رات ......''

ندیم نے اس کی بات کاٹ دی ''کل رات تم نے وہ سب نہیں دیکھا تھا جو میں اب تمہیں اپنے ساتھ لے جا کے دکھانا چاہتا ہوں اور یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لو کہ اپنی تھانے داری کے زعم میں تم نے میری بات کو سنجیدگی سے نہ لیا تو ......''

''تو تم ڈی ایس پی قمر الزماں کو فون کر دو گے۔'' وہ طنز سے بولا۔

ندیم نے جیب سے موبائل فون نکال لیا ''شہر لاہور میں صرف ایک ڈی ایس پی قمر الزماں ہی نہیں ہے' اخبار والے بھی ہیں۔ جب وہ آئیں گے تو میں انہیں وہ سب باتیں بتاؤں گا جو ابھی تمہارے لیے قابل توجہ نہیں ہیں۔ میں نے قاتلوں کو بھی دیکھا ہے اور مقتول کو بھی۔ میری مدد سے پولیس ان کے تصویری خاکے بنا سکتی ہے۔ سوچو اس کے بعد کیا ہوگا؟ ساجن پور جیسے گاؤں میں کتنے ہی لوگ ان خاکوں کو دیکھ کے مقتول کا شجرۂ نسب بھی بتا دیں گے اور قاتلوں کے سارے خاندان کی

ہسٹری بھی......''

تھانے دار کی خودی جو گاؤں کی مسجد کے مینار سے بھی بلند تھی' دھڑام سے ندیم کے قدموں میں گر گئی۔ اس نے ندیم کی ٹھوڑی کو چھوا ''آپ تو غصے میں آ گئے ڈاکٹر صاحب! ہم تو خادم ہیں سب کے۔ آپ کے غلام ہیں۔''

''اگر میں چاہوں تو خود بھی دو دن میں اس قتل کا سراغ لگا سکتا ہوں۔ مگر میرے پاس وقت نہیں ہے اور یہ میرا کام بھی نہیں ہے۔ اس لیے جو کچھ میں بتا رہا ہوں وہ دھیان سے سنو۔ تانگا میں ساتھ لایا ہوں۔ میرے ساتھ چل کے پھر جائے واردات کو دیکھو' مجرموں نے کتنی چالاکی سے اپنے جرم کا سراغ مٹانے کی کوشش کی تھی مگر وہ احمق تھے۔''

تھانے دار نے کڑک کے اپنے ماتحت سے کہا ''اوئے کھوتے' اتنی عقل نہیں ہے تجھ میں۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔ جا کے گھر سے کوئی شربت لسی لا......''

ندیم نے اسے ٹوک دیا ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

تھانے دار کا چہرہ اتر گیا ''آپ اپنی مدعیت میں کوئی رپورٹ درج کراؤ گے؟''

''دیکھو' میرا مقتول سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں نے قتل ہوتے نہیں دیکھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ اس لاش کو وہاں دفنانے کے لیے لائے تھے' وہی قاتل تھے یا نہیں لیکن کل رات میں نے جو دیکھا تھا وہ تمہیں بتا دیا تھا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک قتل ہوا ہے۔ قتل کس کا ہوا ہے' کیوں ہوا ہے' کس نے کیا ہے؟ یہ سب پتا لگانا تمہارا کام ہے۔ میری حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ میں نے کچھ لوگوں کو ایک بڈھے کی خون آلودہ لاش دفنانے کی کوشش کرتے دیکھ لیا تھا جس کا سر غالباً کلہاڑی کے وار سے دو ٹکڑے کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اچانک مجھے دیکھا تو مجھے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ میں ان کے جرم کا واحد چشم دید گواہ بن گیا تھا۔ اگر حسن اتفاق سے میرے پاس ریوالور نہ ہوتا تو وہ گڑھے کو کچھ بڑا کرتے اور مجھے بھی وہیں دفن کر کے چلے جاتے۔ میں ان نامعلوم افراد کے خلاف اقدام قتل کی رپورٹ لکھواؤں گا۔''

تھانے دار نے ہاتھ اٹھایا ''آپ کی بات کاٹنے کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن میرا ایک مشورہ ہے۔ تھانے دار کی حیثیت سے نہیں' کچھ دیر کے لیے فرض کر لیں کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ بڑا بھائی ہوں' میری عمر ایسے ہی معاملات سے نمٹتے گزری ہے اور میرا تجربہ اتنا ہی ہو گا جتنی تمہاری عمر ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میرے جذبات بھی شاید کچھ ایسے ہی ہوتے مگر یہ جذبات کا نہیں عقل سے کام لینے کا وقت ہے۔ اگر تم کچھ نہیں کرو گے تو محفوظ رہو گے لیکن تم نے انصاف اور قانون کی دہائی دی اور قاتلوں کے پیچھے پڑ گئے تو وہ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ تم گاؤں کے باہر ڈسپنسری کے ایک کمرے میں اکیلے رہتے ہو۔''

''مجھے دہشت زدہ کرنے کی کوشش مت کرو'' ندیم نے برہمی سے کہا مگر اس کا لہجہ اب پہلے جیسا پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

''دیکھو ڈاکٹر صاحب! تم نے ایک واقعہ دیکھا۔''

ندیم تلخ لہجے میں بولا ''ایسا ہی جیسے میں دو عورتوں کو دیکھوں کہ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہی ہیں یا دو شخص مرغے لڑا رہے ہیں۔''

تھانے دار نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا ''چلو تم نے ایک جرم کا ارتکاب ہوتے دیکھا اور مجرموں کو دیکھا۔ تم مقتول کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے مگر اپنا قانونی فرض سمجھتے ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک کیا' مجھے بتا دیا۔ اب سمجھو تمہارا کام ختم۔ باقی کام میرا ہے۔ میں نے بڑے بڑے کیس حل کیے ہیں۔ یہ تو کوئی کیس ہی نہیں۔ یہاں قتل کیسے چھپا رہ سکتا ہے۔''

ندیم کا ذہن اس مشورے کی عملی معقولیت کو کسی حد تک تسلیم کرنے لگا تھا کہ اسے تھانے دار کا گزشتہ شب کا توہین آمیز رویہ پھر یاد آ گیا ''فی الحال اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو اور میرے ساتھ چل کے جائے واردات کا پھر معائنہ کر لو۔ تا کہ تمہیں اندازہ ہو جائے کہ میں گزشتہ رات نشے میں تھا اور نہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔''

تھانے دار کچھ مطمئن نظر آنے لگا ''ٹھیک ہے جناب! میں اپنی غلطی مانتا ہوں کہ رات کو جائے واردات کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا۔''

''تو پھر چلو میرے ساتھ' تانگا کھڑا ہے باہر۔''

''تانگے کی خیر ہے' آپ چلو۔ میں اپنی سائیکل پر آتا ہوں۔''

نیم حایٹرھا اور اتھل پتھل کر دینے والے ایک اور سفر کے بعد ندیم تھانے سے واپس اپنی سرکاری رہائش گاہ پر پہنچا تو اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تھانے میں زیر تفتیش رہا تھا۔ بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ کھانا کھاتے ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ تھانے دار کے انتظار میں جاگتے رہنا لاحاصل تھا۔ وہ معمول کے مطابق سو گیا اور جب جاگا تو گھڑی میں شام کے پانچ بج رہے تھے۔ گاؤں کی مسجد سے عصر کی اذان نشر ہو رہی تھی اور اس کے اپنے پرائیویٹ کلینک جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ ہاتھ سے چلانے والے پمپ کے نیچے بیٹھ کر نہاتے ہوئے وہ تھانے دار پر کھولتا رہا جس نے اسے بڑی صفائی سے ٹال دیا تھا۔ ندیم کو اب پہلے سے زیادہ ضد ہو گئی تھی اور اپنی طرف سے باقاعدہ ایف آئی آر درج کرانے کے بارے میں اس کا خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی ایک نقل وہ متعلقہ ڈی ایس پی بلکہ ڈی آئی جی کو بھی ارسال کر سکتا ہے۔ قمر الزماں تو خیر ایک فرضی نام تھا جو اس نے نظریۂ ضرورت کے تحت ایجاد کر لیا تھا مگر وہ ڈاکٹر امجد سے بات کر سکتا تھا۔ کسی جرنلسٹ کو ساری اسٹوری سنا کے اس کی مدد حاصل کر سکتا تھا۔

سوال یہ تھا کہ کیا اس ساری تگ و دو سے کچھ حاصل ہو گا۔ کیا قاتل پکڑے جائیں گے اور کیفر کردار کو پہنچیں گے؟ کب' کتنے سال بعد؟ سیشن کورٹ' ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلے تک خود اس کی مرگ ناگہاں کو کتنے برس بیت چکے ہوں گے؟ یوم حشر سے پہلے کسے خبر ہو گی کہ وہ کہاں مدفون تھا۔ ایک خالہ اور ان کی بیٹی نسرین کے سوا جو کسی ثبوت گواہ کے بغیر ندیم کی منگیتر بنی بیٹھی تھی' اسے رونے والا ہی کون تھا؟ اس مقدمے کا فیصلہ ہونے تک' جس میں مدعی اور چشم دید گواہ بن کے ندیم نے اپنی قبر خود کھودی تھی۔ وہ نہ جانے کتنے بچوں کی ماں بن چکی ہو گی۔

ان حقیقت پسندانہ خیالات نے ندیم کی سخت حوصلہ شکنی کی۔ زندگی کی خوبصورتی کے احساس اور زندہ رہنے کی خواہش نے اسے اتنا مغلوب کر لیا کہ اس کا ذہن منفی سمت میں دلائل دینے لگا۔ ہر روز پاکستان میں اور ساری دنیا میں سیکڑوں ہزاروں بے گناہ کسی دستِ قاتل کا نشانہ بنتے ہیں۔ انہیں خود اپنی وفا شعار اور شوہر پرست نظر آنے والی بیوی کسی آشنا کی مدد سے قتل کر دے یا ڈاکو گھر میں گھس کے مار جائے۔ میں نے مقتول کو دیکھا ضرور تھا مگر وہ کون سا میرا ماما لگتا تھا کہ میں اس کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگاؤں۔ مجھے کون حق و انصاف کی خاطر جان دینے پر شہید کا درجہ دے گا؟

کلینک کے لیے روانہ ہونے تک اس کے خیالات بالکل بدل چکے تھے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب اس کی نظر نے جائے واردات کی طرف دیکھا۔ صبح اس نے تازہ کھدی ہوئی نرم زمین میں جن مرجھائی ہوئی شاخوں کو کھڑا دیکھا تھا وہ اب غائب تھیں۔ اس کے قدم رک گئے اور اس کی نگاہ بے اختیار پیپل کے دوسرے درخت پر گئی۔ رنگین کپڑوں کی دھجیاں اور گوٹے کناری والے ربن اس کی شاخوں پر ابھی تک لہرا رہے تھے مگر ندیم کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ ہوا کہ رات کو اس کی کلینک سے واپسی تک ان کو پھر اصل درخت پر منتقل کر دیا جائے گا۔ پولیس کے ذریعے سے ہر خبر قاتلوں تک اور قاتلوں کی خدمات حاصل کرنے والوں تک پہنچ رہی تھی اور وہ ندیم کی نشاندہی پر ہر سراغ کو مٹاتے جا رہے تھے۔ بالآخر وہ ندیم کے وجود کو بھی مٹا دیں گے۔ آدمی کو اس عالم آب و گل سے عدم آباد ارسال کرنے کے ایک سو ایک آزمودہ نسخے ہیں جن میں الزام صرف دستِ اجل پر آتا ہے۔ بس جی موت تو بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ بڑا اچنگا بندہ تھا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اللہ نے بڑی شفا دی تھی اس کے ہاتھ میں۔ رات کو چنگا بھلا سویا' صبح دیکھا تو فوت شدہ پڑا تھا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ رات کو عقرب سیاہ نے ٹانگ پر ڈس لیا (ٹھنڈی سانس) سچ ہے آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ اس مقولے کو درست ثابت کرنے کے لیے یہاں اور بھی تیر بہدف طریقے رائج تھے۔ لیکن نہ کوئی میڈیکو لیگل آفیسر تھا اور نہ پوسٹ مارٹم کا دستور۔ وجہ فوتیدگی وہی درست جو سیانے کہہ دیں۔ بے شک مولوی صاحب فرما دیں کہ قبرستان میں برگد کے درخت کی چڑیل نے مرحوم کا کلیجہ چبا لیا تھا۔ آخر یہ بدبخت آدھی رات کو وہاں گیا ہی کیوں تھا؟

ندیم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ مندرجہ بالا کسی طریقے سے بھی وفات پانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ڈاکٹر امجد بن کے یہاں حق و انصاف کے لیے منصب شہادت پر فائز ہونے تو نہیں آیا تھا۔ بے حد و حساب دولت کمانے کے علاوہ بھی اس کے بہت سے خواب تھے مثلاً وہ ایشوریا رائے کو شرف بہ اسلام کر کے اس کا نام خیر النساء رکھنا چاہتا تھا اور اس سے عقد مسنونہ کے نتیجے میں گیارہ بچے پیدا کرنا چاہتا تھا۔ خواہش کرنے یا خواب دیکھنے میں کوئی حرج ہے اور نہ پابندی۔

پانچ بجے وہ اپنے کلینک پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر کچھ حیرانی ہوئی کہ اس کا شٹر ابھی تک گرا ہوا تھا۔ عام طور پر ڈاکٹر صاحب کے تشریف لانے سے پہلے ہی نذیر کلینک کی جھاڑ پونچھ سے بھی فارغ ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی مریض قبل از وقت نازل ہو کے پوچھ بیٹھے کہ ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تو وہ بہت برا مانتا تھا۔ ''نہیں آئے کا کیا مطلب اوئے! کہو وہ تشریف نہیں لائے؟''

ندیم نے اپنی چابیوں سے دونوں تالے کھولے اور شٹر اٹھا دیا۔ جھاڑ پونچھ کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ وہ پنکھا چلا کے حاضر اسٹاک میں دستیاب دواؤں کا جائزہ لینے لگا' چھوٹی چوہدرائن کو ایک دن چھوڑ کے لگائے جانے والے طاقت کے ٹیکے ختم ہو رہے تھے۔ شک و شبے کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے ندیم کو بلواتی تھی اور اس

پر واضح بھی کر چکی تھی کہ وہ ندیم پر مرمٹی ہے اور اب اگلے مرحلے میں اس سے ناجائز مراسم استوار کر کے رہے گی۔ آخر وہ کیا کرے؟ کب تک اسے بی کمپلیکس کے ٹیکے لگائے اور اس کی بے شرمانہ اشارے بازی سے کیسے اجتناب کرے۔ یا میرے مولا! گستاخی معاف' آخر تو کیوں چاہتا ہے کہ میرے مرقد پر یہ شعر لکھا جائے۔ حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

رات تک تو مریض آئے اور حسب معمول ان میں ایک دو حماقت کے شاہکار تھے۔ ایک حاملہ خاتون کو دی جانے والی دوا غلطی سے اس کے سسر محترم نے پی لی تھی۔ وہ بار بار اپنے پہلے سے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بڑی تشویش سے پوچھتے رہے "ڈاکٹر صاحب! اب کیا ہوگا؟" ندیم نے یہ حقیقت پسندانہ جواب دینے سے گریز کیا کہ نہ لڑکا' نہ لڑکی۔

اس رات رش کم رہا مگر ندیم اپنے معمول کے مطابق نو بجے تک کلینک میں بیٹھا رہا۔ نون سے نذیر کی بے سبب غیر موجودگی سے اس کے سوا کوئی فرق نہ پڑا کہ ندیم کو شام کی چائے میسر نہ آئی جو اس کا معاون خصوصی اسی کی پسند کے مطابق ایجاد کرنا سیکھ چکا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ نذیر کی غیر حاضری کا کوئی عام سا سبب ہوگا۔ نزلہ زکام' نذیراں کے عشق کا بخار' کسی چوپائے سے تصادم وغیرہ۔

لیکن نو بجے جب وہ روانگی اختیار کرنے کی سوچ رہا تھا (اور اس حتمی فیصلے سے بہت پرسکون تھا کہ قتل کی واردات میں اسے بالکل پنگا نہیں لینا چاہیے) ایک عورت جھپاک سے اندر آ گئی۔ وہ سرتاپا چادر میں لپٹی ہوئی تھی' جو کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مگر وہ اکیلی آئی تھی اور اپنی کاجل بھری ساحر آنکھوں سے اور اپنے چادر کو سنبھالنے والے گورے گداز ہاتھوں سے کوئی نوجوان لڑکی لگتی تھی۔

حسب معمول بوکھلاہٹ کے چند لمحات گزار کے ندیم نے کہا "بی بی' آپ اکیلی آئی ہو؟"

"ہاں' اکیلی آئی ہوں میں" لڑکی کے پُراعتماد اور کسی حد تک برہم لہجے میں بڑی توانائی تھی۔

"اچھا......اچھا' بیٹھو۔"

"میں یہاں بیٹھنے بھی نہیں آئی ہوں ڈاکٹر صاحب!"

ندیم کچھ گھبرایا "چلو...... ایسے ہی بتا دو' کیا تکلیف ہے تمہیں' کیا بیماری ہے؟"

"بیماری پڑے میرے دشمنوں پر' مجھے تکلیف پہنچانے والوں پر۔ میں اپنا علاج کرانے نہیں آئی ہوں۔"

ندیم چکرا گیا "پھر کیا بات ہے۔ دیکھو' یہاں تو میں صرف مریضوں کو دیکھتا ہوں۔"

لڑکی نے چہرے سے چادر ہٹالی "مجھے جانتے ہو؟"

ندیم بھونچکا رہ گیا۔ ڈاکٹر امجد کی وارننگ کے باوجود ابھی تک چوری چھپے اس نے گاؤں کی درجنوں لڑکیوں کو تاڑا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یا تو گاؤں میں حسن نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں یا پھر قصور اس کی نظر کا ہے جس میں لاہور کی بنی سنوری صاف ستھری اور فیشن ایبل لڑکیاں سمائی ہوئی ہیں۔

لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر ندیم پلک جھپکانا بھی بھول گیا۔ وہ بلاشبہ اتنی حسین تھی کہ اس پر غزلوں کا پورا دیوان لکھنا' اس کے لیے ہر رات کیلکولیٹر کی مدد سے تارے گننا یا اس کے باپ کی جوتیاں اٹھانا اور کھانا سب جائز تھا اور اس پر سترہ سال سے ستر سال تک کے نوجوان کو فریفتہ ہونے کا حق حاصل تھا۔

لڑکی نے ڈانٹ کے کہا "میں نے پوچھا' تم جانتے ہو مجھے؟"

ندیم کے حلق سے عجیب مضحکہ خیز آواز نکلی "جی......نہیں۔"

"میں نذیراں ہوں" اس نے ڈاکٹر کی کم علمی پر بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

"اچھا ......اچھا" ندیم نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کے کہا "بیٹھو نذیراں!"

وہ کرسی پر ٹک گئی "ڈاکٹر صاحب! میں بہت پریشان ہوں" بات کرتے کرتے اس کی آواز میں رقت آ گئی۔

خوبصورت عورت کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہر شریف آدمی کی طرح ندیم پر بھی لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تمہارے والد کی طبیعت خراب ہے تو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ایک سرکش قطرۂ اشک رو کے نہ رکا اور اس کی کجراری آنکھوں کی قید سے نکل کے اس کے ریشمی رخساروں پر شام کے پہلے ستارے کی طرح دمکنے لگا "نذیر کو پولیس نے پکڑ لیا ہے' وہ اسے تھانے لے گئے ہیں۔"

ندیم پھر بھونچکا رہ گیا "نذیر کو پولیس نے پکڑ لیا ہے! مگر کس جرم میں؟"

نذیراں نے چادر کے کونے سے آنسو پونچھ ڈالے "کل رات وہ تمہیں سائیکل پر بٹھا کے تھانے لے گیا تھا۔"

"ہاں......" ندیم نے فرض کر لیا کہ نذیر نے اپنی محبوبہ دلنواز کو اس کا پورا بیک گراؤنڈ بھی بتا دیا ہوگا۔ یہ بہرحال ایک سنسنی خیز اسٹوری تھی۔

"وہ عاشق علی کی سائیکل تھی۔ وہ دیوار پھاند کے [illegible]ے (صحن) میں کودا' پھر اس نے دیوار کے اوپر سے [illegible]ئیکل تمہیں دی اور تم نے پکڑی۔"

"ہاں۔"

"چوری میں تم بھی شریک تھے اور اس نے تمہارے لیے [illegible]ی کی تھی مگر پولیس نے صرف اسے پکڑ لیا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ نذیر نے کہا تھا کہ عاشق علی اس کا [illegible]ت ہے اور...... اور واپسی پر اس نے سائیکل اپنی جگہ رکھ [illegible]ی۔ صبح ہونے سے بہت پہلے۔"

"اس پر وہ تھانے دار کو بھی بٹھا کے لایا تھا۔"

"اور واپس بھی چھوڑ کے آیا تھا۔ سچ تو یہی ہے مگر اسے [illegible]ری کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔"

"اس کے خلاف دوسرا سچ لکھا گیا ہے۔"

"دوسرا سچ!"

"عاشق علی نے بیان دیا ہے کہ نذیر نے اس کی نئی [illegible]ئیکل چوری کی اور بیچنے کے لیے شہر جا رہا تھا کہ اس کے ماما [illegible] دیکھ لیا۔ ماے کو سامنے بیٹھی ڈھائی من کی بوری جیسی مامی [illegible]صاف دکھائی نہیں دیتی مگر اس نے چٹی داڑھی کے ساتھ قسم [illegible]ھالی کہ وہ نذیر تھا۔ اس نے نذیر کو روکا تو نذیر بھاگنے لگا مگر [illegible]رے آ رہا تھا چوہدری کا منشی۔ اللہ کرے اس پر دوبار بجلی [illegible]ے۔ سب اسی کی کارستانی ہے۔" وہ پھر رونے لگی۔

ندیم نے کہا "دیکھو۔ رونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے [illegible] بتا دیا اور میں ساری بات سمجھ گیا۔ حقیقت مجھے پہلے بھی [illegible]م تھی۔ اب تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ میں تھانے جاتا [illegible]ں۔ انشاء اللہ دو گھنٹے میں نذیر آ جائے گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "تھانے دار بہت حرامی ہے۔ وہ [illegible]ت کے بغیر اپنے باپ کو بھی نہ چھوڑے۔ اس کے [illegible]ہ...... رپورٹ لکھوائی ہے عاشق علی نے اور منشی نے۔"

"تم فکر مت کرو۔ میں سب سے نمٹ لوں گا۔ تمہیں [illegible]ں اندازہ نہیں کہ میرے تعلقات کہاں تک ہیں۔ میں ابھی [illegible] فون کروں گا" اس نے میز کی دراز سے اپنا موبائل نکال [illegible]کے دکھایا۔

نذیراں نے اسے بے یقینی سے دیکھا "یہ ٹیلی فون ہے؟"

"ہاں۔"

"لیکن شہر سے تو کوئی بھی نہیں آئے گا اس وقت اور صبح [illegible] وہ نذیر کو بہت ماریں گے۔ میں نے سنا ہے......" اس [illegible]ھ کا حوصلہ پھر جواب دے گیا اور وہ رونے لگی۔

اس بے وقوف لڑکی کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ جیسے ایک بڑا بھائی چھوٹی بہن کو گلے لگا کے اس کے آنسو پونچھتا ہے' ایسے ہی وہ نذیراں کو پیار سے چادر اڑھا کے اس کے گھر چھوڑنے کے لیے جانا چاہتا تھا مگر یہ شہر نہیں گاؤں تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کوئی آ گیا تو نہ جانے اس منظر کا کیا مطلب نکالے اور کیا بیان کرے۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ بے حسی اور سنگدلی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

اچانک نذیراں نے اپنی ایک خوبصورت کلائی سے سونے کا اکلوتا کنگن اتار لیا۔ اس میں اسے کچھ دشواری ہوئی۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو؟" ندیم نے کہا۔

نذیراں نے کنگن میز پر رکھ دیا "یہ تم اس لالچی کتے تھانے دار کو دے دینا اور اس سے کہنا نذیرا کو چھوڑ دے۔"

بات اب ندیم کی قوت برداشت سے باہر ہو گئی "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ تمہیں اعتبار نہیں ہے مجھ پر بے وقوف لڑکی!"

"اعتبار نہ ہوتا تو یہ کنگن دیتی۔ یہ میری ماں کی نشانی ہے۔"

ندیم نے برہمی سے کہا "اٹھا لو اسے فوراً۔ اور اپنے ہاتھ میں پہن کے جاؤ۔ تم کیا سمجھتی ہو' میں نذیر کو چھڑا کے نہیں لا سکتا۔ اگر اس رشوت خور تھانے دار کو کچھ دینا بھی پڑے تو کیا میں نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے میں تمہارا کنگن دوں گا۔ تم ہو تو میری چھوٹی بہن کی طرح مگر میں تمہارے منہ پر تھپڑ نہیں مار سکتا۔ کیونکہ تھپڑ مارنے میں پہل تم کر چکی ہو۔ جاؤ' اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آ کے تمہیں اس طرح روتا ہوا دیکھ لے...... جاؤ" ندیم نے دھاڑ کے کہا۔

نذیراں کا رنگ خفت سے زرد پڑ گیا۔ اس نے جلدی جلدی کنگن پھر پہنا اور چادر اوڑھ کے کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے اس نے دونوں ہاتھ ندیم کے سامنے جوڑ دیے "میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی بھائی!"

ندیم نے اسے تیزی سے پلٹ کر جاتا دیکھا اور ٹینشن میں مٹھیاں بند کیے دانت بھینچے تن کے بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کے پانی کا ایک گلاس پیا اور پرسکون کرنے والے چند لمبے گہرے سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ چوہدری کے دربار میں حاضری دینے اور رات کا کھانا کھانے کے بجائے وہ اپنے ایک عقیدت مند کے گھر پہنچا' جس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کے اعجاز مسیحائی نے اس کے اکلوتے بیٹے کی زندگی بچائی تھی۔

ڈاکٹر کو اپنے دروازے پر دیکھ کے وہ کچھ حیران ہوا

ندیم نے کسی تمہید کے بغیر کہا ''مجھے تمہاری سائیکل چاہیے' یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟''

اپنے کمرے سے اس نے ریوالور کے علاوہ ایک ٹارچ لائٹ اور کچھ نقد رقم لی جو دو ہزار سے زیادہ تھی۔ اس نے تو فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ قتل کے اس کیس کو بھول جائے گا مگر تقدیر کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔ نذیر کی گرفتاری کے اسباب بھی اب اس پر عیاں ہونے لگے تھے۔ اس نامعلوم بوڑھے کو قتل کرنے والے کسی بااثر شخصیت کے بندے تھے۔ یہ بات تو وہ پہلے بھی جانتا تھا مگر اب نذیر کی گرفتاری میں چوہدری کے منشی کے کردار نے یہ بات ثابت کردی تھی کہ وہ بااثر شخصیت چوہدری کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی۔ نذیر کو اس جرم کی سزا دی گئی تھی کہ اس نے چوہدری کے اور اس کے بندوں کے خلاف قانونی کارروائی اور تفتیش کے عمل کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر کی مدد کی تھی۔

حسب توقع پولیس چوکی میں نون سے نذیر بالکل روایتی انداز میں زیر تفتیش تھا یعنی اسے ننگا کرکے اس ہک سے الٹا لٹکا دیا گیا تھا جو ویسے تو پنکھے کے لیے لگایا گیا تھا مگر محکمۂ پولیس کے وسائل اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ ایک دیہی پولیس چوکی کے عملے کو پنکھا بھی فراہم کیا جائے۔ تاہم ہک کا بہتر مصرف تلاش کرلیا گیا تھا۔ اس میں بے آواز پاک و پاکیزہ فین کی جگہ بہ آواز بلند چلانے والا ملزم تیرہ نمبر کے چھتر کی ہر پرجوش ضرب مجاہدانہ کے ساتھ ڈانس کررہا تھا۔

ہماری پولیس کے پاس مغرب کی ترقی یافتہ اور مہذب کہلانے والی پولیس کے مقابلے میں مادی وسائل نہ سہی' اعترافِ جرم کرانے کے ذرائع کہیں زیادہ موثر ہیں۔ وہ بلاوجہ ذہانت کا استعمال کرکے فنگر پرنٹس اور ڈی این اے ٹیسٹ جیسے سائنسی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ سراغ لگانے کے لیے خوار پھرتے ہیں اور ملزم کے ساتھ جرح میں دماغ سوزی کرتے ہیں۔ یہاں ایک ان پڑھ کانسٹیبل بھی وہی نتائج ایک کمرے میں رات بھر کی کارروائی سے برآمد کرلیتا ہے۔

تھانے دار صاحب اس وقت شاید اپنی سرکاری رہائش گاہ پر محو استراحت تھے اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے اپنے اکلوتے ماتحت کو مامور کرگئے تھے۔ کانسٹیبل تفتیش کی جسمانی مشقت سے تھک گیا تھا اور کرسی پر بیٹھ کے ہانپ رہا تھا۔ وہ ملزم کی ڈھٹائی سے جھنجلایا ہوا تھا جو اپنا جرم قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

شاید نون سے نذیر کو اپنے بارسوخ اور جرأت رندانہ رکھنے والے باس کی تائید و امداد پر خدا سے زیادہ بھروسا تھا اور وہ خجالت کے اس لمحے کے انتظار میں تیرہ نمبر چھتر کے ہر وار کو جھیل رہا تھا۔ جب ڈاکٹر قہر و غضب کا پیکر بنا نمودار ہوگا اور خود تفتیش کرنے والوں کا بھی پیشاب خطا ہوجائے گا۔ خود کانسٹیبل کے لیے بھی ندیم کی آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ تھانے دار اسے بتا گیا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب آئیں گے تو غصے میں فضول بکواس فرمائیں گے۔

نذیر کی حالت دیکھ کے ندیم کی آنکھوں میں واقعی خون اتر آیا اور اس نے دھاڑ کے کہا ''یہ کیا ہورہا ہے؟''

کانسٹیبل کے ردِعمل نے ندیم کو کچھ حیران کیا۔ وہ مسکرانے لگا ''وہی جو آپ کو نظر آرہا ہے۔''

نذیر دھاڑیں مار مار کے رونے لگا ''سر جی' اس حرامی نے مار مار کے میری چمڑی اتار دی ہے۔ میں مرجاؤں گا سر جی! آپ کو اللہ رسول کا واسطہ......''

ندیم نے اسے ڈانٹا ''تم چپ کرو۔ مجھے بات کرنے دو۔''

نذیر چپ ہوگیا ''اتارو اسے نیچے!'' ندیم نے غرا کے کانسٹیبل کو حکم دیا۔

کانسٹیبل ذرا بھی متاثر نہیں ہوا ''آپ میرے افسر نہیں ہو ڈاکٹر صاحب! تھانے دار صاحب جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ جب تک ملزم اعترافِ جرم پر دستخط نہ کردے' اس کو چھوڑا نہ جائے۔''

نذیر نے پھر واویلا کیا ''اس...... نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میں مرگیا تو مجھے بھی وہیں گاڑ دیں گے۔''

کانسٹیبل نے اقرار میں سر ہلایا ''یہ دھمکی نہیں۔ تھانے دار صاحب کا حکم ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ بے شک ڈی ایس پی قمر الزماں کو فون کرکے سب بتا دو۔''

ندیم کے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ اس نے ایک دم آگے بڑھ کے کانسٹیبل کی گردن دبوچ لی اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ کانسٹیبل جسمانی طور پر بھی ندیم کے مقابلے میں کمزور تھا مگر ریوالور دیکھ کے تو اس پر جیسے نزع کا عالم طاری ہوگیا۔

ندیم نے اسے جھنجوڑ کے دس گالیاں دیں۔ ان میں سے آدھی تھانے دار سے معنون تھیں۔ ''ڈی ایس پی کو جب آنا ہوگا آجائے گا۔ ابھی تو میں آیا ہوں تم سے بات کرنے اور اگر تم نے ڈھنگ سے بات نہ کی تو ڈی ایس پی آئے گا تمہارے لاپتا ہونے کی تحقیقات کرنے۔''

اس نے ''اوق...... اوق'' کرتے ہوئے خود کو ندیم سے چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی ''سر...... سر جی!''

''سر جی کے بچے' میں تجھے ابھی لٹکاتا ہوں نذیر کی جگہ۔ لتر دل اب تیری ہوگی صبح تک اور صبح میں تجھے وہیں گاڑ دوں گا یہاں تو نذیر کو گاڑنا چاہتا تھا۔ ایسی کی تیسی تیرے تھانے دار کی۔ کون ہے اس وقت یہاں دیکھنے والا۔''

پہلے وہ واقعی غصے میں تھا مگر غصے کی پاگل کردینے والی لہر گزر گئی تو ندیم نے کانسٹیبل کی گردن چھوڑ کے اسے ایک دھکا دیا اور وہ فرش پر گر کے ہاتھ جوڑنے لگا اور بے ربط الفاظ میں معافی مانگنے لگا۔ بدقسمتی سے اسی وقت اس کی سرکاری وردی والی پتلون بھی گیلی ہوگئی۔

ندیم نے نذیر کو سہارا دے کر نیچے اتارا اور جب اس نے کپڑے پہن لیے تو اسے کانسٹیبل کے خلاف جوابی انتقامی کارروائی سے روکا کیونکہ اس وقت تک ندیم کی عقل بھی ٹھکانے آچکی تھی۔ نذیر نے پانی پیا تو ڈاکٹر نے اسے حکم دیا کہ کانسٹیبل کو بھی پلائے۔ وہ کچھ مایوس ہوا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا رویہ ان عزائم کے برعکس تھا جن کا وہ اعلان کرچکے تھے۔

کانسٹیبل کی ملزم نذیر کے سامنے بہت بے عزتی خراب ہوئی تھی۔ اندر سے وہ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا ہوگا مگر مجبور تھا کہ ندیم کے سامنے عاجزی اور شائستگی کا پیکر نظر آئے۔ ظاہر ہے' یہ ڈبل رول اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

ندیم نے تھانے دار کی کرسی پر بیٹھ کے کانسٹیبل کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اگرچہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں مگر وہ ملزم کو خون آشام نظروں سے گھورتا ہوا اور مستقبل کے نتائج کی خاموش دھمکی اپنی نگاہوں سے دیتا ہوا سامنے آگیا۔ ''نذیر کا کیا جرم ہے؟''

''یہ سائیکل چور ہے۔''

''تو خود چور' گنے چراتا ہے۔ مولیاں چراتا ہے کھیتوں سے اور مرغیاں' سارا گاؤں جانتا ہے۔ ایک بار تو یہ بکرا لے جاتے ہوئے بھی پکڑا گیا تھا۔''

ندیم نے نذیر کو ڈانٹا ''تم اپنی بکواس بند کرو اور چپ نہیں رہ سکتے تو دفع ہوجاؤ یہاں سے۔'' پھر وہ کانسٹیبل سے مخاطب ہوا ''کیا اس کے خلاف پرچہ کاٹ دیا گیا ہے؟''

کانسٹیبل نے نفی میں سر ہلایا ''ابھی تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔''

ندیم اٹھ کھڑا ہوا ''ٹھیک ہے۔ اب میں جارہا ہوں تھانے دار کی طرف۔ میری واپسی تک صورتِ حال جوں کی توں رہنی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ واپسی پر مجھے ایک مقتول اور دوسرا قاتل ملے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کروگے۔ یہ ہے تمہاری خاموشی کی قیمت'' اس نے سو کا ایک نوٹ کانسٹیبل کی طرف بڑھایا۔

کانسٹیبل کے چہرے پر رونق لوٹ آئی ''میں تو اس کی منحوس شکل بھی نہ دیکھوں مگر کیا کریں ڈاکٹر صاحب! نوکری ہے'' اس نے نوٹ کو بڑی عقیدت سے جیب میں رکھ لیا۔

تھانے دار لباس شب خوابی میں سخت برہم نمودار ہوا۔ یہ لباس ایک انڈرویئر پر مشتمل تھا جس نے شاید اس کے جسم کے پانچ فیصد حصے کو نمائش عام سے بچا رکھا تھا۔ ندیم کی شکل دیکھتے ہی وہ پلٹ کے بھاگا۔ یوں جیسے اس نے اپنے مقابل آدم خور شیر کو دیکھ لیا ہو۔ چند منٹ بعد وہ باقی کپڑے چڑھا کے لوٹا۔

''مجھے پتا تھا تم تڑی دینے آؤ گے'' تھانے دار نے اپنا برہمی والا انداز برقرار رکھا ''لیکن میں تھانے میں تمہارا منتظر تھا۔ مجھے تم سے اس بدتمیزی کی امید نہیں تھی کہ تم مجھے آدھی رات کو جگاؤ گے۔''

''میں ایک معزز اور شریف آدمی کی طرح تمہارے گھر آیا ہوں۔ میرا تڑی دینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا تھا۔''

''سودا......!''

''ہاں۔ باہمی مفاد کا ایک سودا۔ برابری کی بنیاد پر۔ کیا ضروری ہے کہ ہمارے درمیان انڈیا پاکستان جیسے تعلقات ہوں۔ ہم چین اور پاکستان کی طرح بھی تو رہ سکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہیں نیند سے بیدار کرنا پڑا لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو' یہ معاملہ ہی ایسا تھا۔''

وہ سخت تذبذب کا شکار ہوگیا ''مجھ سے سیدھی صاف بات کرو۔''

ندیم نے کہا ''کیا ہم کہیں بیٹھ کے بات نہیں کرسکتے؟''

وہ بادل ناخواستہ پھر اندر آیا اور اس نے اپنی سرکاری رہائش گاہ کا مہمانوں کا کمرا کھول دیا۔ یہ مشکل سے دس بارہ فٹ کا کمرا تھا جس میں بید سے بنائی ہوئی کرسیوں پر ہاتھ سے کاڑھے ہوئے کشن رکھے تھے۔ ندیم پاؤں پسار کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا ''تھانے دار صاحب! مجموعی صورت حالات پر کافی حقیقت پسندانہ انداز میں غور فرمانے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اپنے ضمیر سے مفاہمت کرلوں۔ اپنی قانونی اور اخلاقی ذمے داریوں کو بھول جاؤں کیونکہ دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر رکھتے ہوئے جینا ناممکن نہ سہی' عذاب ضرور ہوجاتا ہے۔''

تھانے دار کچھ ایزی ہوا ''سب عقلمند ایسا ہی کرتے ہیں۔''

کی مظلوم شکل اور قاتلوں کے خطرناک عزائم دیکھ کر ہی مجھے پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ چوہدری جیسے کسی طاقتور نے اس نامعلوم بڈھے کو کسی ناقابلِ برداشت گستاخی کی سزا دی ہے۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے' ہر روز ہوتا ہے۔ مجھے صرف اپنا فائدہ دیکھنا چاہیے جو چوہدری کی دوستی میں ہے' دشمنی میں نہیں۔"

"تمہیں ابھی چوہدری کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ تم اس سے کیا لڑو گے۔ حالانکہ تعلقات کی تڑی دیتے رہتے ہو تم۔"

ندیم نے کہا "ویسے تو وقت پڑنے پر بلی بھی شیر کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہے اور کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ چیونٹی ایک ہاتھی کو گرا سکتی ہے۔ شہر میں میرے اچھے خاصے مراسم ہیں اور آج کل تو گاؤں کی ان پڑھ عورت بھی ظلم کی داستان سنانے پریس کلب پہنچ جاتی ہے اور ہیومن رائٹس والے بھی اپنی پبلسٹی کے لیے ایسے کیس کو خوب اچھالتے ہیں۔ مگر ایک تو اس سے نظام نہیں بدلتا' دوسرے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اور آدمی کو اپنا فائدہ پہلے دیکھنا چاہیے۔ یہ سب سوچ کے میں نے فیصلہ کیا کہ ایک ایسے شخص کے لیے جسے میں نہ صورت سے جانتا تھا نہ نام سے۔ مجھے قانونی لڑائی میں پڑ کے اپنا وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے زیادہ سے زیادہ اس کی مغفرت کے لیے دعا کر کے اسے بھول جانا چاہیے۔ میں اپنے اختیارات اثر و رسوخ اور قانونی وسائل کی مدد سے بلاوجہ کی جنگ میں تم سے اور چوہدری سے کیوں لڑوں؟"

تھانے دار تلخی سے بولا "یوں کہو نا کہ تم ڈر گئے؟"

ندیم نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا "ایک بھروسا مجھے خدا پر ہے۔ دوسرا اپنی ذات پر۔ میں اس گاؤں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ واپس شہر بھی جا سکتا ہوں اور ضد پر آ جاؤں تو سب کی ایسی تیسی بھی کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ میں بدمعاشوں کے لیے بدمعاش بھی ہوں۔ بھرا ہوا ریوالور ساتھ لے کے پھرتا ہوں۔ جو کام ایک قاتل خنجر سے لیتا ہے' وہ میں انجکشن کی سوئی سے لے سکتا ہوں۔ میں گولی چلاتا نہیں' کھلاتا ہوں۔ اس علاقے میں ڈاکوؤں کا جو سب سے خطرناک گروہ ہے۔ مجھے اس کے سرغنہ کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے جانتے ہو گے۔ میں اس گروہ کا معالج بھی ہوں۔ گزشتہ ماہ ایک ڈاکو کو گولی لگ گئی تھی۔ وہ مجھے لے گئے۔ میں نے آپریشن کر کے گولی نکال دی اور پھر مرہم پٹی بھی کرتا رہا۔ وہ ڈاکو بچ گیا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے خود سرغنہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا علاج میں نے کیا۔ اس کے بدلے میں عزت احترام کے علاوہ مجھے کیا ملا؟ یہ میرا بزنس سیکرٹ ہے۔ میں تم سے بھی نہیں پوچھوں گا کہ وہ تمہیں کیا دیتے ہیں۔ یہ تمہارا بزنس سیکرٹ ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے کہنے پر وہ میرے کسی بھی دشمن کو اٹھا کے لے جا سکتے ہیں۔ پھر وہ لوٹ کے آتا ہے یا نہیں' یہ غیب کی باتیں ہیں جو کوئی نہیں جانتا۔ ان حالات میں میرے کسی سے ڈرنے کا کیا سوال۔"

تھانے دار کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی۔ خواب عشرت سے جگائے جانے پر اس کی برہمی ایک دوستانہ مسکراہٹ میں بدل گئی اور اس نے ڈاکٹر کو معزز مہمان کا درجہ دیتے ہوئے کہا "چلو چھوڑ دو جی پرانی باتیں۔ یہ بتاؤ' ٹھنڈا چلے گا کہ گرم۔"

"کچھ نہیں۔ یہ بتاؤ نذیر کو باعزت طور پر چھوڑنے کا تم کیا لو گے؟" ندیم نے کسی لحاظ کے بغیر کہا۔

تھانے دار نے بے چینی سے پہلو بدلا "دیکھو جی۔ اس کے خلاف بڑا سنگین الزام ہے۔"

ندیم نے جیب سے دو ہزار نکالے اور درمیان میں پڑی ہوئی میز پر ڈال دیے۔ "میں نذیر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

تھانے کی نظر نوٹوں سے چپک کے رہ گئی "ڈاکٹر صاحب' یہ میرے اختیار میں نہیں۔"

"تمہارے اختیارات کی حد کوئی نہیں۔ اگر چوہدری صاحب اسے چیلنج کریں تو مجھے بتانا۔ میرے اختیارات کا بوجھ بھی تمہارے پلڑے میں ہو گا۔ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نذیر کو لینے کے لیے آیا ہوں تو ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔"

آہستہ آہستہ تھانے دار کا ہاتھ نوٹوں کی طرف بڑھا "آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

ندیم اٹھ کھڑا ہوا "کیا ہم چوکی چلیں؟"

☆☆☆

ندیم نے بے اختیار پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر اس وقت تک نذیر اس کے پاؤں پکڑ چکا تھا چنانچہ وہ فرش پر پیچھے کی طرف گرا اور اس کا سر ہلکے سے دھماکے کے ساتھ سرکاری میز پر لگا۔ اسے دن میں تارے نظر آنے کے محاورے پر یقین آ گیا۔

بدحواس نذیر نے اسے کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی "ڈاکٹر صاحب! غلطی ...... مجھ سے ...... مجھے معاف کر دیں۔"

نذیر نے اشارے سے واضح کیا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ سر کے اندر اور باہر سب خیریت ہے" بیٹھ جاؤ آرام سے۔"

نذیر پھر بھی عرق ندامت میں غرق کھڑا رہا۔ "دراصل ...... میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنی چمڑی کے جوتے بنوا کے آپ کو پہناؤں تو بھی کم ہو گا۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔"

ندیم نے کمر کو ہلا کے کہا "آہ ...... دو چار دن تو میں بھی تمہاری مہربانی کو نہیں بھولوں گا۔ لیکن مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے۔ وہ جو نذیر کی مؤنث ہے' نذیراں ...... وہ ایک پاگل لڑکی ہے۔"

نذیر نے گھڑے جیسا سر ہلایا "اس میں کیا شک ہے جناب!"

ندیم نے چلّا کے کہا "شک کے بچے۔ وہ تمہارے لیے پاگل ہے۔ اس سے شادی کر لو فوراً۔"

نذیر احمقوں کی طرح سر کھجانے لگا "فوراً......"

"ہاں فوراً...... ابھی ...... اسی وقت ...... نکاح پڑھوانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ ایک گواہ میں ہوں' ایک اور پکڑ لاؤ۔"

نذیر کی عقل خبط ہو گئی "لیکن سر ...... اس وقت ......"

ندیم نے میز پر ہاتھ مارا "نکاح کے لیے کوئی وقت مقرر ہے؟ کہاں رہتا ہے مولوی' مجھے بتاؤ ...... میں اسے لاتا ہوں۔ تم جا کے دلہن کو لے آؤ۔"

نذیر کو اب کوئی شک نہ تھا کہ میز پر سر لگنے سے ڈاکٹر صاحب کے دماغ کے اندر کی سب چولیں ہل گئی ہیں "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!"

"میں کیا فارسی بول رہا ہوں اُلو کے پٹھے۔ شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ بھاگ جاؤ شہر۔ صبح والی پہلی بس پکڑ لو۔"

نذیر نے ایک لمبا گہرا سانس لیا "یہ ناممکن ہے سر۔ اس کا خبیث باپ' وہ گولی مار دے گا مجھے۔"

"اول تو اس کی بندوق میں گولی ہو گی نہیں۔ ہو گی تو اس کی نال ٹیڑھی ہے۔ نشانہ وہ تمہارا لے گا تو مرے گا کوئی اور لیکن میرے ہوتے وہ تمہیں گولی مار دے' ناممکن۔ پہلے میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ آخر وہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ تم کیوں ڈرتے ہو اس سے اتنا۔ وہ لڑکی تو نہیں ڈرتی۔ اس کا باپ نہیں مانتا' نہ مانے ...... تم نذیراں کو ایسے ہی لے کر بھاگ جاؤ۔ شہر جا کے شادی کر لینا۔ میں تمہیں اپنے ایک دوست کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہ تمہاری نوکری اور رہائش سب کا بندوبست کر دے گا۔ تم یہاں رہے تو مارے جاؤ گے۔"

لیکن ندیم کی ساری کوشش اکارت گئی۔ نذیر میں اتنی ہمت بھی نہ تھی۔ اس نے پھس پھس روتے ہوئے اعتراف کیا "میں بزدا ...... ہوں ڈاکٹر صاحب!" جو لفظ اس نے استعمال کیا وہ بزدل ہونے کی انتہا کو ظاہر کرتا تھا۔

انجام کار ندیم کو اس کے ساتھ نذیراں کے گھر جانا پڑا۔

اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب ندیم کے سوال پر وہ [illegible] بڈھا دستی بم کی طرح نہیں پھٹا بلکہ اس نے بڑی ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اب آپ آئے ہو تو میں انکار [illegible] کر سکتا ہوں لیکن ایک تو شادی ایسے نہیں ہو سکتی جیسے آ[illegible] چاہتے ہو۔ لوگ سمجھیں گے کہ نہ جانے کیا بات تھی جو را[illegible] رات لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔ مجھے تم سے کم بھی ایک ہفتے [illegible] مہلت چاہیے تاکہ میں سب کو نیوتا دے سکوں۔ میرا خاند[illegible] ہے یہاں اور ذات برادری کے لوگ ہیں۔ اور گاؤں [illegible] معززین ہیں۔ ان سب کو بلانا ضروری ہے۔"

"یہ کوئی فرض نہیں ہے۔ آپ بے شک مولوی صاحب بلا کے پوچھ لو۔" ندیم نے ضبط سے کام لیا۔

حوالدار نے سر ہلایا "آپ نے ٹھیک فرمایا۔ مگر جو ش[illegible] میں ہوتا ہے یہاں نہیں ہوتا۔ گاؤں کے دستور کچھ اور ہو[illegible] ہیں۔"

نذیر جو مذاکرات کے دوران میں یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے [illegible] اس سے بڑا شرم و حیا کا اور شرافت کا پیکر کوئی نہیں' ہر معا[illegible] میں اپنے سسر کی تائید میں سر ہلا رہا تھا اور ایسے سر جھکائے بیٹ[illegible] تھا جیسے ندیم اس کا باپ ہے جو دلہن کے باپ سے کامیاب مذاکرات کر رہا ہے چنانچہ اسے بڑوں کی بات میں بالکل نہیں بولنا چاہیے۔

حوالدار نے اچانک ایک سوال داغ دیا "دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ نون سے نذیر اپنی گھر والی کو لے کر کہاں جائے گا؟ اسے کہاں رکھے گا؟ اس کا اپنا گھر تو کوئی ہے نہیں۔ جہاں یہ اب رہتا ہے' وہاں تو شادی کے بعد اس کو کوئی گھسنے بھی نہیں دے گا۔ کیوں نذیر؟"

مگر نذیر کے لاجواب ہونے سے پہلے ندیم نے فرطِ جذبات میں کہہ دیا "یہ ذمے داری میری۔"

حوالدار نے اسے بے یقینی سے دیکھا "آپ اسے گھر دلاؤ گے؟"

"نہیں ...... یہ وہاں رہیں گے جہاں اب میں رہتا ہوں۔"

"اور آپ خود......؟"

"میں رات کو سونے کے لیے کلینک میں چلا جاؤں گا۔ کچھ عرصے بعد یہ آپ کے پاس آ سکتا ہے۔ ایک بیٹی کے سوا کون ہے آپ کا۔ آپ کو بھی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ نذیر کے لیے بھی آپ اس کے باپ کی جگہ ہو۔ وہ آپ کی خدمت کرے گا۔"

حوالدار [illegible]

رہے گا؟ میں بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔''

''کیوں؟ یہ کون سی شرع کے خلاف ہے اور کس قانون کے تحت جرم ہے۔ آپ نے تو دنیا دیکھی ہے۔ آپ نے جرمنوں کے چھکے چھڑا دیے۔ جاپانیوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ پھر یہ جاہل گاؤں والے آپ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

ندیم نے بڈھے کو بانس پر چڑھا دیا تھا۔ اس نے زور سے سینے پر ہاتھ مار کے کہا ''خدا کے سوا میں کسی سے نہیں ڈرتا'' اور پھر زور زور سے کھانسنے لگا۔ ''نذیراں! او پتر نذیراں۔ پانی دے مجھے اور دیکھ' مہمان آئے ہیں' کچھ چائے شائے لا......''

نذیر کا چہرہ جو سسرال میں قدم رکھتے ہوئے زیرو واٹ کے بلب کی طرح بجھا بجھا نظر آتا تھا' اب فرطِ مسرت سے سو واٹ کے ہنڈے کی طرح چمک رہا تھا۔ خوشی نے اسے اتنا پاگل کر دیا تھا کہ واپسی پر وہ سارا راستہ سر کے بل افریقا کا قبائلی رقص کرتے ہوئے جا سکتا تھا اور ڈاکٹر کو کندھے پر بٹھا کے گاؤں کی گلیوں میں گھوڑے کی طرح ہنہناتا ہوا دوڑ کے یہ اعلان کرنا چاہتا تھا کہ نذیراں اس کی ہو گئی ہے اور اس فتحِ عظیم کا سہرا ڈاکٹر کے سر ہے۔

جب بالآخر ندیم اپنے معمول کے مطابق چوہدری کی کوٹھی پر پہنچا تو وہ اندر سے بہت مطمئن تھا۔ اس نے بروقت ہوشمندی سے کام لے کر ایک جذباتی ردِعمل کی تلافی کر دی تھی اور خود کو ایک غیر محفوظ مستقبل کے اندیشوں اور نقصانات سے بچا لیا تھا۔ نذیر کو دوسری جنگ عظیم کے فاتح حوالدار کی فرزندی میں دینے کا فوری فیصلہ بھی دفاعی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا۔ اب نذیر کسی کمیں یا مزارع کا نہیں' فوج کے کھاتے سے پنشن پانے والے توپ خانے کے سابق حوالدار کا داماد تھا جو آج بھی توپ نہ سہی بندوق بہرحال چلا سکتا تھا۔

چوہدری کے ڈیرے پر ندیم کو کچھ غیر معمولی ہلچل نظر آئی۔ حویلی کے بند پھاٹک کے باہر ایک چارپائی پر دو افراد بندوقیں لیے بیٹھے تھے۔ ان کی ایک جیسی جھاڑ جھنکاڑ داڑھیاں۔ نتھنوں کے دونوں طرف چار چار انچ تک پھیلی ہوئی کلف والی مونچھیں اور ایک ایک تھان کی گھیر دار شلواریں تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آدم خور شیر جیسی بھوک کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے بند مٹھی کی پہلی اور دوسری انگلی میں سگریٹ پھنسا رکھی تھی اور وہ پیٹ کی مشک سے سانس کھینچ کر ایک کش میں سگریٹ ختم کرنے کی پریکٹس کر رہا تھا۔ دوسرا

لسی یا روح افزا وغیرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چوہدری کا ایک ملازم ان کے سامنے دم دبائے کھڑا تھا۔

ندیم ان سے تعرض کیے بنا اس چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا جو بڑے پھاٹک کا ایک حصہ تھا اور ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

''اوئے پائے خاں دے پتر۔'' ایک شیر نے غرا کے کہا ''کہاں جا رہا ہے ایسے منہ اٹھا کے؟''

ندیم نے متانت سے جواب دیا ''چوہدری صاحب سے ملنے اور پھر ملازم سے مخاطب ہو گیا۔ ''یہ کون لوگ ہیں؟''

ملازم نے جلدی سے کہا ''یہ خاص مہمان ہیں جی۔ آج کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں مگر آپ جاؤ۔''

''یہ کون ہے؟'' دوسرے شیر نے دھوئیں کا ایک بادل فضا میں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہی ہیں جی اپنے ڈاکٹر امجد صاحب!'' ملازم نے اس کے لیے پھاٹک کھول دیا۔

اندر وسیع احاطے میں چوہدری کی گاڑی کے ساتھ ایک بکتر بند گاڑی جیسی جیپ کھڑی تھی۔ یہ انیس سو باون ماڈل کی ملٹری جیپ تھی جس میں دستور کے مطابق ٹویوٹا ہائی لکس کا ڈیزل انجن ڈال دیا گیا تھا اور باہر کی باڈی پر دو انچ موٹے فولادی پائپوں سے ایک جنگلا سا بنا دیا گیا تھا۔ پائپوں [illegible] کرومیم پلیٹنگ کا لشکارا تھا اور سامنے [illegible] اوپر کی طرف چار اضافی ہیڈ لائٹس نصب کر دی گئی تھیں۔ جیپ کے ٹائر بدل کے جہاز کے ٹائر لگا دیے گئے تھے اور اس میں بھی ایک گھنی داڑھی والا ڈرائیور کی جگہ بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ندیم کے لیے شک و شبے کی کوئی بات ہی نہ رہی۔ وہ سب یقیناً ڈاکو تھے اور چوہدری کے خاص مہمان تھے۔ عام درباری آج لوٹا دیے گئے تھے مگر ندیم کو باریابی کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ اس کے لیے خاصی تشویش کی بات تھی۔ شاید اسے پھر چھوٹی چوہدرائن کا ''معائنہ'' کرنا پڑے۔ ایک سنسنی خیز اور خطرناک عمل۔

لیکن بیٹھک میں قدم رنجہ فرما کے ندیم کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ صوفوں کے درمیان بچھے ہوئے قالین پر گاؤ تکیوں کے سہارے سفاچٹ چہرے والا ایک ایسا شخص نیم دراز تھا جو دیکھنے میں معزز اور قطعی بے ضرر لگتا تھا۔ سوائے اس کی نشے میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی اور ہپناٹائز کرنے والی آنکھوں کے جن سے وہ ندیم کو پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہ مجرمانہ درشتی بھی نہیں تھی جو چوروں' ڈاکوؤں اور

اعمال کی چغلی کھاتی ہے۔

چوہدری اس کے سامنے نیم دراز تھا اور سامان نائو نوش ان کے درمیان جملہ لوازمات کے ساتھ سجا ہوا تھا "آؤ بیٹھو ڈاکٹر صاحب! تمہارے دوست تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔"

اس کے ساتھ ہی اچانک ان دونوں نے ایسا فلک شگاف قہقہہ لگایا کہ ندیم اچھل پڑا! "میرے دوست......!" اس نے ہمت کر کے نو وارد سے مصافحہ کیا۔

"ہاں، کل ہی تو تم نے تھانے دار کو بتایا تھا کہ تم ان کے گرد کے معالج خصوصی ہو" چوہدری نے گلاس خالی کر دیا۔

ندیم کی ٹانگوں میں جیسے جان نہیں رہی۔ وہ دھپ سے وہیں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں اب اس پر نظریں جمائے مسکرا رہے تھے اور ایک پلیٹ میں سے نمکین بادام اٹھا اٹھا کے منہ میں ڈالتے جا رہے تھے۔ انہیں انتظار تھا کہ ندیم اپنی صفائی میں کچھ بولے۔

ندیم نے خود کو سنبھال کے اور کھنکار کے کہا "دیکھیے جی، میں نے تھانے دار کے سامنے جھوٹ بکا تھا۔ میں مانتا ہوں مگر میرا مقصد کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا نہیں تھا۔ میں ایک بے گناہ کی جان بچانا چاہتا تھا۔ لوگ اپنا مطلب نکالنے کے لیے خدا رسول کی جھوٹی قسم تک کھا لیتے ہیں۔ میں نے ان کا نام لے لیا تو کون سا گناہ کیا۔ اس تھانے دار نے آپ کو یہ تو نہیں بتایا ہوگا کہ اس نے ملزم کو رہا کرنے کا معاوضہ دو ہزار روپے نقد بھی مجھ سے وصول کیا تھا۔"

چوہدری نے اور اس کے خاص مہمان نے ایک دوسرے کی طرف کچھ حیران اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ندیم نے اپنی بات جاری رکھی "اب آپ پوچھو گے کہ وہ بے گناہ کیسے ہوا؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ میں اس کے جرم میں برابر کا شریک تھا۔ اس نے سائیکل دیوار کے اوپر سے اٹھائی اور باہر میں نے لے لی۔ ہم اس پر سوار ہو کے ایک ساتھ تھانے گئے مگر واپسی پر ہم نے وہ سائیکل پھر وہیں رکھ دی تھی۔ اس پر میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔"

"مگر تم نے تھانے دار کے سامنے جھوٹ بولا تھا کہ تم نے ایک لاش دیکھی تھی جسے کچھ لوگ گاڑنا چاہتے تھے......" چوہدری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ندیم نے ایک گہری سانس لی "بے شک وہ میری غلطی تھی۔ شاید میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ یا ممکن ہے اس رات میں نے زیادہ پی لی ہو۔ میں اس جھوٹ کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں، جو بھی آپ دیں۔"

تھے، اس کی سزا اسے فوراً بھگتنا پڑی "یار، ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ تم شوقین مزاج بھی ہو" چوہدری نے کہا اور ایک جام بھر کے اس کی طرف بڑھا دیا "لو پیو۔"

ندیم بری طرح پھنس گیا۔ خود کردہ را علاج نیست۔ اب انکار ناممکن تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگی اور آنکھ بند کر کے جام خالی کر دیا۔

"یہ ڈاکٹر تو اچھا بندہ ہے۔" ڈاکوؤں کے سردار نے چوہدری سے کہا۔

"بندہ تو برا نہیں۔ بس ہو گئی تھی اس سے ایک بے وقوفی۔" چوہدری نے فراخ دلی سے کہا "ہم سب سے ہو جاتی ہے۔"

"اب تک تو نہیں تھے تم۔ مگر آج سے تم ہمارے سرکاری ڈاکٹر ہو۔" ڈاکوؤں کے سردار نے اس سے ہاتھ ملایا "ہمیں جب ضرورت پڑے گی، تمہیں بلا لیں گے۔"

ندیم کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی "جی...... کیوں نہیں۔"

اچانک سارے خدشات اور خطرات بے وجود ہو گئے تھے۔ ندیم خود کو بے پناہ طاقتور محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ وہ بیک وقت دو سپر پاورز کا اتحادی بن گیا تھا۔ تیسری دنیا کے ممالک جیسے لوگوں میں، بھوک یا بیماری اور افلاس یا جہالت ہے تو وہ کیا کرے؟ ان کے حقوق کے لیے شہید ہو جائے؟ کس کام آئے گی اس کی یہ قربانی؟ وہ خود اپنے لیے کیوں نہ جیے۔ صرف ایک بار ہی تو زندگی ملتی ہے۔

جب وہ کھانے کے بعد جانے کے لیے اٹھا تو اس پر نشہ بری طرح غالب تھا۔ کمرا اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا اور فرش اس کے قدموں کے نیچے پانی پر بہنے والا تختہ ہو گیا تھا۔

چوہدری نے اسے پھر بٹھا لیا "ابھی سے جا کے کیا کرو گے ڈاکٹر۔ تمہاری کون سی بیوی ہے جو راہ دیکھ رہی ہے۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے کہا "یہاں تو ابھی موج میلہ شروع ہوگا۔ کوہ قاف سے پریاں اتریں گی۔"

ندیم کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کا جی بری طرح متلا رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ اس کا سب کھایا پیا یہیں نکل جائے گا۔ "نہیں جی...... وہ دراصل، میرا جی کچھ ٹھیک نہیں...... میں معافی چاہتا ہوں۔"

اس نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا۔ وہ

نے اس کی حالت پر ایک قہقہہ لگایا اور اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو ان کے گھر تک چھوڑ آئے۔

شراب نے اس کے وجود میں آگ سی بھر دی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کے جوتے کپڑے اتارے بغیر بستر پر دراز ہو گیا اور پنکھے کے ساتھ گھومتی ہوئی چھت کو دیکھنے لگا۔ اس کی طبیعت میں رفتہ رفتہ بہتری آنے لگی۔ احساسِ جرم اور گناہ کی جگہ اس کے ذہن کو سرور آفریں خیالات نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ آنکھیں بند کر کے اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا ہو کے ہوا کے دوش پر پرواز کر رہا ہے۔

کچھ دیر بعد اسے یوں لگا جیسے کوئی ہلکے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ پھر اس دستک میں چوڑیوں کی جھنکار شامل ہو گئی۔ ندیم نے آنکھیں کھول کے غور کیا۔ کیا یہ اس کا فریب خیال تھا؟ یا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی کوشش سے اپنی نگاہ وال کلاک پر مرتکز کی۔ رات کے گیارہ بجے اس کے دروازے پر ایسے کون دستک دے گا۔ ضرورت مند ہوگا تو دروازہ دھڑ دھڑائے گا اور زور زور سے چلائے گا۔ "ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب!" یوں سرگوشی کے انداز میں اتنی آہستگی سے دروازے پر ہاتھ مارنے والی عورت بھلا کون ہو سکتی تھی، جس کی چوڑیاں بھی یوں بولتی ہوں جیسے کوئی منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستا ہے۔

پھر چوڑیاں بولیں تو وہ بڑی کوشش سے اٹھا اور دروازے تک گیا۔ "کون ہے" اس نے نیم غنودگی میں کہا اور دروازہ کھول دیا۔ عطر بیز ہوا کے جھونکے کے ساتھ سیاہ ریشمی چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت جھپاک سے اندر آ گئی۔ ندیم نے ایک لمحے کے لیے گورے گدرائے ہوئے ہاتھ دیکھے جو دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کے بند کر رہے تھے۔ پھر رات جیسی کالی چادر اس کے شانوں سے پھسل کے نیچے گر گئی اور وہ پلٹی تو جیسے دن نکل آیا۔

ندیم کی آنکھیں چندھیا گئیں اور اس کا سارا جسم پتھر ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا "آپ......!"

وہ برق تپاں کی طرح لہرائی اور اس کی ہیجانی ہنسی مکڑی کے جالے کی طرح ندیم کے گرد پھیل گئی۔ "ہاں میں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں کھڑکی کھلی رکھوں گی اور تم نہ آئے تو کسی روز خود آ جاؤں گی۔"

"لیکن...... اس وقت...... اکیلی۔"

وہ ایک قدم آگے آئی "اکیلی بھی آ سکتی تھی مگر میری

ندیم لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا۔ "اگر...... چوہدری......"

"چوہدری" وہ کھلکھلا کے ہنسی "آج رات اسے خود اپنا ہوش نہیں ہوگا۔ کوہ قاف سے پریاں جو اتری ہیں حویلی میں۔ صبح تک مجرا چلے گا۔ پھر چاند ڈوب جائے گا اور سورج دوپہر تک طلوع نہیں ہوگا مگر تم اتنے بدحواس کیوں ہو؟"

ندیم اور پیچھے ہٹا مگر اس کے بازو جیسے کسی چڑیل کے بازوؤں کی طرح لمبے ہوتے چلے گئے۔ ندیم نے خود کو ان کی گرفت میں بڑی بے بسی کے ساتھ محصور پایا۔ مزید پسپا ہونے کی جگہ بھی نہ تھی۔ وہ بیڈ سے ٹکرا کے پیچھے کی طرف گر گیا۔ چوہدرائن کا نرم ریشمی لمس اس کے احساس پر چھا گیا۔ ایک مفلوج کر دینے والی گرم مہک نے اس کے ہوش و حواس کو مختل کر دیا۔ شراب کی آتش سیال پہلے ہی اس کے بدن میں آگ لگا چکی تھی۔ شباب کی جانفزا ٹھنڈک نے اسے کیسے شکست دی۔ اس کا جواب ایک لطیفے میں ہے۔

ایک خاندانی شکاری کی فل آف سسپنس اینڈ ہارر اسٹوری میں وقفہ آیا تو دم بخود سامعین میں سے کسی نے پوچھا "جب تمہارے والد نے آدم خور شیر کو چند فٹ کے فاصلے پر دیکھا۔ گولی نہیں چلی اور بندوق ان کے ہاتھ سے گر گئی تو انہوں نے کیا، کیا؟"

شکاری نے آہ بھر کے کہا "پھر میرے والد مرحوم کے کرنے کے لیے کیا رہا تھا، جو کیا شیر نے کیا۔"

شیرنی نے ایک شکم سیر انگڑائی لی اور "گارا" کیے ہوئے بکرے کو دیکھ کر مسکرائی "اب میں چلتی ہوں۔"

ساکت و صامت پڑے ہوئے ندیم نے دیوار پر لگے ہوئے کلاک کو دیکھا۔ اس کی اندھیرے میں چمکتی سوئیاں صبح کے چار بجا رہی تھیں۔

"اگلے ہفتے چوہدری پیشی پر شہر جائے گا" وہ سیاہ ریشمی چادر لپیٹ کر بولی "تم آؤ گے؟"

ندیم نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا "نہیں۔"

وہ ہنسی "کیوں ڈرتے ہو نامرد ہو کے۔ چلو، میں ہی پھر آ جاؤں گی" وہ دروازہ کھول کے باہر رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ وہ دن کا اجالا پھیلنے تک پُر وحشت اور ہولناک خیالوں کے جنگل میں بھٹکتا رہا۔ جب نون سے نذیر آیا تب بھی وہ مہاتما بدھ کے شانتی آسن میں آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنی وفاتِ حسرت آیات کے دردناک مناظر کے اور اپنی آخری رسوم کے مختلف شاٹس کسی ہدایت کار کی چشم تصور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے نذیر کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

نے تشویش میں مبتلا ہو کے پوچھا۔

ندیم چونکا ''میں...... میں کوئی اچھا سا شعر سوچ رہا تھا۔ اپنی لوحِ مزار کے لیے۔ اسے میری قبر پر لگوا دینا۔ اگر قبر ہو کہیں۔''

نون سے نذیر بھونچکا رہ گیا ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں' صبح صبح ڈاکٹر صاحب!''

ندیم نے ایک آہ بھری ''میری زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں دوست۔ دعا کرو تمہارے ولیمے میں شرکت کی مہلت مل جائے۔ اس سے پہلے ہی دارِ فانی سے کوچ کر جاؤں تو قاضی سے کہنا نکاح کے بعد سوئم کی فاتحہ بھی پڑھ دے۔''

کانی یہاں دستیاب نہیں تھی چنانچہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد ندیم نے دو کپ سیاہ چائے کے پیے تو اس کی دماغی حالت کچھ ٹھیک ہونے لگی۔ جسم ابھی تک شبِ گزشتہ کے سرور میں ڈوبا ہوا تھا اور اسے یہ دنیا بہت بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے دماغ کا کوئی پاگل حصہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ایسی رنگین راتوں کے بعد یہ زندگی مختصر بھی ہو جائے تو پچھتاوا کیسا۔

ندیم کا خیال تھا کہ اس نے کمال فہم و فراست سے وہ تمام معاملات سنبھال لیے ہیں جو وقتی جذبات کی رو میں بہنے سے بگڑ گئے تھے مگر تدبیر کند بندہ' تقدیر کند خندہ۔ چھوٹی چوہدرائن نے جذباتِ عشق میں خطرات کی بارڈر کراس کر کے اسے بھی موت کی وادی میں کھینچ لیا تھا۔ وہ کسی خوبصورت بلا کی طرح اس سے چمٹ گئی تھی' جس سے نجات دلانے کا کوئی تعویذ وظیفہ مولوی صاحب کے پاس بھی نہیں تھا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے لامحدود گناہوں کی پاداش میں قدرت کی طرف سے اس پر آفات کے نزول کا ایک سلسلہ ہے جس کا ابھی آغاز ہوا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

☆☆☆

وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے زور زور سے اس کے دروازے پر دستک دینا شروع کیا۔ لگتا تھا اس کے کنڈی کھولنے تک آنے والا دروازہ توڑ ڈالے گا۔

''یا میرے مولا' کیا قیامت آ گئی'' اس نے زیرِ لب کہا۔

اور دروازہ کھول دیا۔ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح ایک لڑکی سیدھی اس کی بانہوں میں سما گئی۔ ندیم بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ایک دم پلٹ کے کنڈی لگائی اور پھر ندیم کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہو گئی ''خدا کے لیے مجھے کہیں چھپا دو۔''

ندیم کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ لڑکی کے بال الجھے ہوئے تھے اور میلے کپڑے بھی کہیں کہیں سے پھٹ گئے تھے۔ وہ مشکل سے بیس بائیس سال کی لڑکی تھی اور حور پری تو نہیں تھی مگر قبول صورت تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ خوف اور پریشانی کے تاریک سایوں نے اس کی اصل صورت کو بگاڑ دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آہوئے صیاد دیدہ کی وحشت تھی اور اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''دیکھو...... دیر مت کرو۔ مجھے چھپا دو کہیں۔ وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ یہ...... یہ لائٹ بجھا دو۔''

''کون......'' ندیم نے بڑی مشکل سے کہا اور لائٹ بجھا دی۔

''شکاری کتے۔ میرے باپ کے قاتل۔ وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔''

''مگر میں...... میں تمہیں کہاں چھپاؤں؟'' ندیم کے اوسان خطا ہونے لگے۔

''کہیں بھی...... کسی بھی جگہ......'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''لیکن...... ان دو کمروں میں' ایسی کون سی جگہ ہے؟ تم خود سوچو۔'' ندیم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''جلدی کرو'' وہ بدحواسی سے بولی ''تمہیں خدا کے رسول کا واسطہ۔ میں بڑی مشکل سے بھاگ کے یہاں تک آئی ہوں۔''

ندیم کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا مگر اس کے لیے یہ بھی ناممکن تھا کہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والی اس لڑکی کو باہر نکال دے یا ہوسناک بھوکے بھیڑیوں کے حوالے کر دے جو اس کے جوان بدن کو نوچ کھائیں اور اس کی آبرو کا لہو پی جائیں۔

''اچھا دیکھو' میرے بیڈ کے نیچے گھس جاؤ۔ سانس روک کے پڑی رہو۔'' اس نے سرگوشی میں کہا ''میں اوپر سو جاتا ہوں۔ اگر کوئی آیا تو میں اسے ٹالنے کی کوشش کروں گا۔ خدا کرے وہ مجھ پر یقین کریں...... جاؤ...... جلدی کرو۔'' اس نے لڑکی کو اندھیرے میں پکڑ کے بیڈ تک پہنچایا۔ وہ چھپکلی کی طرح اس کے نیچے رینگ گئی۔

ندیم دھک دھک کرتے دل کو سنبھالے بیڈ پر لیٹا رہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے معبود! دنیا جہاں کی بلاؤں نے میرا گھر کیوں دیکھ لیا ہے۔ اندھیرے میں وہ کچھ نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کے کان باہر کی ہر آواز پر لگے ہوئے تھے۔ باہر کتے بھونک رہے تھے۔ دور کہیں گیدڑ چلا رہے تھے۔ آج اس نے غور سے سنا تو اسے بہت سی نئی آوازیں سنائی دیں۔ نہ جانے کہاں ایک اُلو بول رہا تھا۔ جھینگر اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ خاموشی اچانک اپنا وجود کھو بیٹھی تھی۔

ندیم نے اندھیرے میں ایک گلاس پانی پیا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ پھر اسے لڑکی کا خیال آیا۔ اس نے چادر کا کونا اٹھا کے بیڈ کے نیچے جھانکا ''وہ لاش کی طرح سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔

''پانی پیو گی۔''

''ہاں...... بہت پیاس لگی ہے مجھے۔''

''اچھا نیچے سے نکل آؤ اور دیکھو' خدانخواستہ کوئی آئے تو ایسے درمیان میں مت لیٹنا' بالکل آخری حصے میں دیوار کے ساتھ لگ جانا۔ میں تمہیں میلے کپڑے دے دوں گا۔ وہ اپنے پیچھے اور اوپر ڈھیر کر لینا۔''

وہ سرک کے باہر آ گئی۔ ندیم نے اسے پانی کا گلاس دیا جسے اس نے ایک سانس میں خالی کر دیا ''اور......''

ندیم اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اب اندھیرے میں بھی وہ اس کی صورت کی پرچھائیں دیکھ سکتا تھا ''کب سے پیاسی ہو تم؟''

''صبح سے۔''

''تم نے کچھ کھایا ہے...... بولو......؟''

وہ خاموش رہی۔

''دیکھو۔ اب تم یہاں آ ہی گئی ہو تو ڈرو نہیں۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔''

''میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے'' وہ بولی۔

''بے وقوف۔ تمہیں خالی پیٹ اس طرح پانی نہیں پینا چاہیے تھا۔ میں دیکھتا ہوں کھانے کے لیے کچھ ہے یا نہیں۔ یہاں میں اکیلا رہتا ہوں۔'' ندیم اٹھا۔

''مجھے معلوم ہے۔''

''تم جانتی ہو مجھے؟'' ندیم نے اندھیرے میں ایک الماری سے بسکٹ کا ڈبا نکالا اور پھر اس کے پاس آ گیا۔

''تم ڈاکٹر امجد ہو'' اس نے کہا۔

''یہ بسکٹ کھا لو۔ مگر آہستہ آہستہ...... ابھی دو چار بسکٹ کھا لو۔ باقی کچھ دیر بعد۔''

وہ بسکٹ کھانے لگی ''سوائے تمہارے میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔''

''لیکن تم ہو کون؟ یہ تم نے ابھی تک نہیں بتایا۔''

''میں...... بدنصیب بختاور ہوں۔ مولوی قدرت اللہ کی بیٹی۔'' وہ اچانک گھٹنوں پر سر رکھ کے اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

کسی جھجک یا خوف کے بغیر ندیم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ''دیکھو۔ رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم یقیناً ایک بہادر لڑکی ہو۔ مجھے بتاؤ' تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ تم نے بھروسا کیا ہے مجھ پر تو میں بھی تمہارے لیے جو کچھ ہو سکا ضرور کروں گا۔''

اندھیرے میں وہ اتنے قریب تھے کہ ایک دوسرے کی سانسوں کو سن اور محسوس کر سکتے تھے۔ ایک جیسے نظر آنے والے دو اجنبی سائے۔ ایک جوان لڑکی' ایک نامحرم جوان مرد۔ لیکن اعتماد کا جو رشتہ انہیں یکجا کر چکا تھا وہ ایک ناقابلِ تسخیر حفاظتی حصار کی طرح تھا جس میں ہوس اور معصیت کے زہرناک خیالات اور نفسانی خواہشات کے سنپولیے جو ایسے ہی اندھیرے میں جنم لیتے ہیں' اس اعتماد کے تقدس کو پامال نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ندیم کے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی ''انہوں نے میرے باپ کو مار دیا۔''

ندیم بے خیالی میں اس کے سر کو تھپکتا رہا۔ اس کا ذہن اس رات کے تصور میں گم تھا جب اس نے داڑھی والے ایک بوڑھے کی خون آلود لاش کو فرشِ خاک پر پڑا دیکھا تھا اور ان قاتلوں کے سفاک چہرے دیکھے تھے جو اپنے جرم کا سراغ مٹانے کے لیے اس لاش کو زمین میں گاڑنا چاہتے تھے۔

اچانک باہر سے آوازوں کا ہلکا سا شور سنائی دیا۔ بختاور ایک دم چونک کے سیدھی ہو گئی۔ ''وہ...... اِدھر آ رہے ہیں۔''

ندیم نے کہا ''فکر مت کرو۔ وہ اندر آئیں گے نہیں اور آ گئے تو تمہیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔''

''اور...... انہوں نے مجھے دیکھ لیا...... تو؟'' اس نے کانپتی آواز میں معصومیت سے پوچھا۔ اس سوال کے بعد بھی کئی سوال ہو سکتے تھے۔ پھر تم کیا کرو گے؟ تم مجھے ان کے حوالے کر دو گے۔ اپنی جان بچانے کے لیے ایک کمزور اور بے گناہ لڑکی کو بھوکے کتوں کے آگے ڈال دو گے؟ میرا تم سے کیا رشتہ کہ میری عزت و عصمت بچانے کے لیے تم اپنی جان خطرے میں ڈالو۔ تم تو مجھے بڑی تسلی دے رہے تھے ابھی......

ندیم نے کہا ''تم نیچے چھپ جاؤ۔ میں کچھ کرتا ہوں۔''

''کیا...... کیا کرو گے تم......؟''

آوازیں جواب بہت قریب آ گئی تھیں' ندیم نے اسے دھکیل کر بیڈ کے نیچے کر دیا۔ ''اب تم میری حفاظت میں ہو۔ اور میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہے۔ کوئی تمہیں مجھ سے چھین کے نہیں لے جا سکتا۔''

بختاور بیڈ کے آخری کنارے پر دیوار کے ساتھ چپک گئی۔ ندیم نے اندھیرے میں جلدی جلدی اپنے دیواروں پر ٹنگے ہوئے کپڑے بیڈ کے نیچے پھیلائے اور چادر کا کونا اٹھا کے اطمینان کیا کہ ایک نظر میں بختاور کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر وہ بستر کے اوپر لیٹ گیا اور اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کی دھمک سینے سے باہر کسی کو سنائی نہ دے۔ اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے رہے اور دم بدم کم ہوتے فاصلے کو محسوس کرتے رہے۔

پھر کسی نے کہا ''اوئے' وہ ادھر نہیں آئی ہوگی۔''

''وہ ادھر ہی آئی ہے۔ میں نے خود اسے اس طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ حرام زادی چھلاوے کی طرح غائب ہوگئی۔''

''ڈاکٹر سو رہا ہے' اسے مت جگا۔ چوہدری صاحب خفا ہوں گے۔''

''چوہدری صاحب سے میں بات کرلوں گا'' یہ آواز عین دروازے کے باہر سے سنائی دی تھی پھر کسی نے دروازے کو بجایا ''ڈاکٹر صاحب!......ڈاکٹر صاحب!''

ندیم نے ریوالور تکیے کے نیچے سے نکال کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور خوابیدہ لہجے میں پکار کے کہا ''او یار! کون ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب! ایک منٹ کے لیے باہر آؤ۔''

ندیم نے اطمینان سے لائٹ جلائی اور دروازہ کھولا۔ ایک جماہی لے کر اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا ''کیا بات ہے' کون ہو تم؟''

تیس پینتیس سال کے خون آشام آنکھوں والے مرد نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا ''مجھے چوہدری غلام رسول نے بھیجا ہے۔''

''کیا ان کی طبیعت خراب ہے؟'' ندیم نے ایک انگڑائی لی۔

''طبیعت خراب ہو ان کے دشمنوں کی'' دوسرے نسبتاً کوتاہ قامت اور بھاری بدن شخص نے کہا۔

پہلے والے نے اندر جھانکنے کے لیے گردن لمبی کی۔

''دیکھو ڈاکٹر صاحب! ہم ایک لڑکی کو تلاش کر رہے ہیں۔''

''کون لڑکی!''

''میری گھر والی بھج لوا ہے'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

''ہوش میں رہ کے بات کرو مجھ سے۔'' ندیم نے برہمی سے کہا'' تمہاری گھر والی کا یہاں کیا کام؟''

اس نے ندیم کو دھکیل کر ایک طرف کر دیا ''ہم نے اسے ادھر ہی آتے دیکھا تھا۔ تم صرف یہ بتا دو کہ وہ یہاں تو نہیں ہے؟''

ندیم نے دھاڑ کے کہا ''بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ آدھی رات کو مجھے نیند سے جگا کے پوچھتے ہو......''

اس نے ندیم کو دھکا دے کر دیوار سے لگا دیا ''بھونکنے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر۔ ہم خود دیکھیں گے۔ چل اوئے' تو دیکھ۔''

پستہ قامت نے بڑی مستعدی دکھائی۔ اس نے دوسرے کمرے کی لائٹ جلا کے دیکھا۔ دواؤں کی الماری کھولی پھر باتھ روم میں گیا۔

''میں تمہاری شکایت کروں گا بڑے چوہدری صاحب سے'' ندیم نے غرا کے احتجاج کیا ''کیا سمجھ رکھا ہے آخر تم نے مجھے؟''

''یہاں تو کوئی نہیں گامیا'' باتھ روم کی طرف سے آواز آئی۔

ندیم پوری کوشش کر رہا تھا کہ بیڈ کی طرف نہ دیکھے ''یہاں آ کے میری جیب میں بھی دیکھ لو۔ میز کی درازوں میں دیکھ لو۔''

مسٹر گامیا نے اپنے ماتحت کو طلب کر لیا ''چل ادھر آ جا' منجی کے نیچے دیکھ۔''

ندیم کے دل کی دھڑکن معدوم ہونے لگی۔ اگلا ایک لمحہ فیصلہ کن تھا۔ بختاور کی تلاش میں آنے والوں کے پاس بظاہر کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تاہم کسی کی ڈب میں کمانی دار خنجر کی موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جب دوسرے شخص نے رکوع میں جا کے چادر کا کونا اٹھایا تو ندیم کا دل دھڑکنا چھوڑ چکا تھا مگر وہ ایکشن کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس کے کان محض ایک آواز کے منتظر تھے۔ مل گئی گامیا! کنجری نیچے لیٹی ہے۔ بس اس کے ساتھ ہی وہ گامیا کو دھکا دیتا اور ریوالور نکال لیتا۔ اس کی دلی تمنا تو یہ تھی کہ وہ ان دونوں کو بیچ بیچ گولی مار دے اور صبح ہونے سے پہلے ان کی لاشیں کہیں پھینک آئے مگر اس کا دماغ اس حد تک ضرور کام کر رہا تھا کہ اس نے چھوٹی مصیبت سے جان چھڑا کے بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے سے گریز کیا۔

چادر کا کونا اٹھا کے نیچے جھانکنے والا سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس نے نفی میں سر ہلایا تو ندیم نے اپنی رکی ہوئی سانس بھی آہستہ آہستہ خارج کی۔ گامیا نے ڈاکٹر کو چھوڑ دیا۔ ''تکلیف معاف!''

ندیم نے ایک لمبی گہری پرسکون سانس لی ''تم جاہل اور بے وقوف ہو۔ اس لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اب جاؤ تاکہ میں بھی سکون سے سو سکوں۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے باہر نکل گئے۔ ندیم بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا تھا اور اس کی ٹانگیں جیسے بے دم ہو گئی تھیں۔ عمداً اس نے دروازے کو فوراً بند نہیں کیا اور لائٹ بھی جلنے دی۔ وہ لوگ ابھی قریب ہی موجود تھے اور آس پاس کے درختوں میں بختاور کو تلاش کر رہے تھے۔ ندیم ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ کے بستر پر لیٹ گیا۔ ''وہ لوگ چلے گئے۔ لیکن تم ابھی آرام سے نیچے لیٹی رہو'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا مگر اسے جواب میں نیچے کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی۔

دس منٹ بعد اس نے اٹھ کے ایک گلاس پانی پیا اور لائٹ بجھانے سے پہلے بہ آواز بلند دروازہ بند کر دیا۔ اندھیرا ہوتے ہی اس نے پھر دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ چاروں طرف گھوم پھر کے اس نے ہر طرف پھیلی ہوئی رات کی تاریکی اور ویرانی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا اور اپنے کانوں سے کسی انسانی آہٹ کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس علاقے سے دور تھے یا واپس چلے گئے تھے اور ان کے دوبارہ آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

ندیم نے دروازہ بند کیا اور بولا ''بختاور۔ نیچے سے نکل آؤ۔ خطرے کی کوئی بات نہیں رہی'' مگر جواب میں بختاور کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ بیڈ کے نیچے سے نہیں نکلی۔

ندیم نے پھر کہا ''بختاور۔ وہ گئے۔ باہر آ جاؤ'' مگر وہ تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں۔ ندیم نے چادر کو اوپر اٹھا کے نیچے جھانکا اور اسے پھر پکارا۔ کپڑوں کے ڈھیر کے پیچھے کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ سمجھ گیا کہ خوف اور دہشت سے بختاور بے ہوش ہو گئی ہے۔ اسے گھسیٹ کر باہر نکالنے کے لیے ندیم کو خود ہی بیڈ کے نیچے گھسنا پڑتا۔ اس نے بیڈ کو اپنی طرف گھسیٹ لیا اور دیوار کی طرف اتر گیا۔ وہاں ایک کروٹ پر آنکھیں بند کیے بختاور بے حس و حرکت پڑی تھی۔

ندیم نے اسے اٹھا کے بیڈ پر سیدھا لٹایا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن وہ ہوش میں نہیں آئی۔ ایک بار پھر باہر نکل کے ندیم نے ہر طرف دیکھا اور کوئی انسانی آواز یا آہٹ سننے کی کوشش کی۔ لائٹ جلانے سے پہلے وہ اچھی طرح اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ بختاور کے جسم و جاں کے طلبگار شکاری چلے گئے ہیں۔

ندیم نے ایک چادر کو دہرا کر کے کھڑکی پر پھیلایا اور دوسری کو دروازے پر۔ اس احتیاط کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے بلب کے گرد ایک موٹا گتا اس طرح رکھ دیا کہ روشنی نصف کمرے تک محدود ہو گئی۔ کھڑکی اور دروازے کی طرف والا حصہ اب تقریباً تاریک تھا۔

اس نے پانچ سی سی کی ایک سرنج کو دوا سے آدھا بھرا اور بختاور کے بازو کی سنہری جلد پر کسی رگ کی نیلاہٹ تلاش کرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ سوئی کو رگ میں داخل کرتا' بختاور نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھی۔

ندیم نے سرنج میز پر رکھ دی ''بختاور۔ وہ چلے گئے تم بالکل محفوظ ہو۔''

بختاور نے پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا ''چلے گئے' تم سچ کہہ رہے ہو؟''

ندیم نے اسے لٹا دیا ''دیکھو یہاں صرف میں ہوں۔ اب تم آرام سے لیٹو۔ میں تمہیں دوا دیتا ہوں۔ اس سے آدھے گھنٹے میں تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر میں تمہارے لیے اور اپنے لیے چائے بناتا ہوں۔''

وہ خاموش لیٹی ویران نظروں سے چھت کو گھورتی رہی۔ کچھ بولے بغیر اس نے ندیم کے ہاتھ سے گولی لے کر پانی کے ساتھ نگل لی اور پھر لیٹ گئی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ نیند تو خیر اب خواہش و امکاں کی حد سے بھی پرے چلی گئی تھی۔ ندیم کا ذہن چائے بناتے ہوئے متضاد اور متحارب خیالات کی رزم گاہ بنا ہوا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے' وہ کیا کر سکتا ہے؟ اپنی دانست میں ندیم نے بڑی دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک نامعلوم بوڑھے کے قتل کا بوجھ اپنے ضمیر پر سے اتار دیا تھا اور خود غرضانہ بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاتلوں کے ساتھ اپنے مفادات کا سودا کر لیا تھا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ تقدیر کی بساط پر دستِ غیب کی اگلی چال سے اسے پھر مات ہونے والی ہے۔

چائے اور بسکٹ بختاور کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے کہا ''یہ غلام رسول کون ہے؟''

''چوہدری کا چھوٹا بھائی! گاؤں کا سب سے خطرناک جنگلی سانڈ۔ جس کے ہاتھوں کسی کی عزت محفوظ نہیں......'' وہ پُراعتماد انداز میں باتیں کرنے لگی۔

''اسی نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا؟''

''ہاں۔ میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔''

ندیم چائے کا مگ لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کیا کرو گی تم؟''

''میں اسے قتل کر دوں گی۔''

''اچھا!......وہ کیسے؟'' ندیم اسے دیکھتا رہا۔

وہ بسکٹ کھاتی رہی اور چائے پیتی رہی۔ ''اگر تم مجھے اپنا پستول دے دو۔ تو تمہاری بڑی مہربانی۔''

ندیم مسکرانے پر مجبور ہو گیا ''پہلے کبھی پستول چلایا ہے؟''

''نہیں۔ تم سکھا دینا۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ تم نہ پکڑی گئیں تو میں پکڑا جاؤں گا۔ وہ جو تمہارے والد کو قتل کرنے کے بعد یہاں دفنانے کے لیے لائے تھے'' ندیم نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا ''میں نے انہیں دیکھا تھا اور انہوں نے میرے ہاتھ میں یہ پستول دیکھا تھا۔''

''پھر تم تھانے گئے تھے۔ تمہارا خیال تھا کہ پولیس انہیں پکڑ لے گی۔''

''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟''

''مجھے نذیراں سے معلوم ہوا۔ وہ میری سہیلی ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموشی سے چائے پیتا رہا ''چوہدری غلام رسول کی تمہارے والد سے کیا دشمنی تھی؟''

وہ اداس ہو گئی'' وہ سچ بولتے تھے۔ ظلم کو ظلم کہتے تھے۔ صرف خدا سے ڈرتے تھے۔ چوہدریوں نے انہیں کئی بار دھمکیاں دیں مگر وہ کہتے تھے کہ تم کیا کر سکتے ہو؟ زیادہ سے زیادہ مجھے مار سکتے ہو۔ موت کا ایک دن معین ہے۔''

ندیم ایک دیہاتی لڑکی کے منہ سے غالب کا شعر سن کے بھونچکارہ گیا'' تم...... تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟''

''میں نے پرائیویٹ بی اے کا امتحان دیا ہے۔''

ندیم دس سیکنڈ میں دوسری بار بھونچکارہ گیا'' وہ کیسے؟''

''چھٹی جماعت تک میں نے یہاں اسکول میں پڑھا۔ پھر اسکول چھوڑ دیا اور گھر میں پڑھتی رہی۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے مجھے تاندلیانوالہ جانا پڑتا تھا۔ ماں ہر روز تانگے میں میرے ساتھ جاتی تھی۔''

''تمہیں پڑھایا کس نے' والد نے......؟''

''نہیں۔ میں نے خود پڑھا۔ ابا تو حافظ تھے۔ دین کی سمجھ رکھتے تھے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ جب میں نے میٹرک کر لیا تو میری ضد پر انہوں نے شہر سے مجھے انٹر کا سارا کورس لا کے دیا۔ انٹر کا امتحان دلوانے وہ مجھے لاہور لے گئے تھے۔ وہاں ان کے کوئی جاننے والے تھے۔ میں ان کے گھر میں رہی تھی۔ پھر ایسے ہی بی اے کا امتحان دیا۔ نتیجہ آنے والا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے' تم پاس ہو جاؤ گی؟''

وہ بڑے اعتماد سے بولی ''فرسٹ کلاس آنی چاہیے میری۔''

وہ اسے حیرانی سے دیکھتا رہا ''مضامین کیا تھے تمہارے؟''

''لازمی تو ہوتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ ہسٹری اور سوشیالوجی اور...... اسلامک اسٹیڈیز۔''

''ہوں'' ندیم نے غور فرما کے کہا'' اس کے بعد کیا کرو گی تم...... ایم اے؟''

وہ اداس ہو گئی حالانکہ ندیم یہ گفتگو اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کر رہا تھا۔'' اگر اللہ کو منظور ہوا۔ ابھی تو نہ میرا گھر ہے نہ در۔ وہ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اللہ انہیں غارت کرے۔''

''آمین!'' ندیم نے خوش دلی سے کہا مگر وہ مسکرائی نہیں۔

''اچھا یہ بتاؤ'' اس نے کچھ دیر بعد کہا'' تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

ندیم سیریس ہو کے سوچ میں پڑ گیا'' یہ بہت مشکل کام ہے مگر اب تم ٹھیک ہو۔ پہلے تو مجھے ساری بات بتاؤ' پھر کچھ سوچتے ہیں۔''

وہ کچھ دیر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اپنے ایک پیر کے انگوٹھے کو کریدتی رہی اور شاید خیالات کو مجتمع کر کے اظہار کی زبان دینے کے لیے الفاظ تلاش کرتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا ''بتانے کو اب کیا رہا ہے۔ ابا مولوی قدرت اللہ مرحوم بڑے حوصلہ مند اور صابر تھے۔ جب میری ماں کا انتقال ہوا تو میری عمر صرف چھ سال تھی۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی تھا جو پہلے ہی فوت ہو گیا تھا۔ ابا نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی اور مجھے باپ کے ساتھ ماں بن کے پالا۔ جب حق گوئی و بے باکی کے باعث چوہدریوں سے ان کا اختلاف شروع ہوا تو سب نے انہیں سمجھایا کہ وہ اپنے لیے مشکلات پیدا نہ کریں مگر مولوی قدرت اللہ نے سب کو ایک ہی جواب دیا کہ میں منافق نہیں ہوں کہ میرے رب نے مجھے واضح حکم دیا ہے کہ میرا ہر قول و فعل شریعت محمدیؐ کے مطابق ہونا چاہیے۔ چوہدری کی خوشنودی کے لیے میں اس میں مصلحت کا جھوٹ شامل کر دوں۔ چوہدری کی ناراضی سے ڈر جاؤں اور اللہ کی ناراضی سے نہ ڈروں۔ خدا وہ دن نہ دکھائے۔ خود چوہدریوں نے انہیں کئی بار سرزنش کی اور انجام سے ڈرایا مگر وہ ڈرنے والے کہاں تھے۔ چوہدریوں کے اشارے پر مولوی قدرت اللہ مرحوم کے خلاف شرمناک الزامات کی ایک مہم شروع کی گئی۔ اب میں ان کی تفصیل کیا بتاؤں؟ وہ سب سو فیصد جھوٹ تھا جو چوہدری کے حواریوں نے مولوی قدرت اللہ کے کردار پر کیچڑ اچھالنے کے لیے بولا۔ لوگ انہیں جانتے تھے۔ مولوی قدرت اللہ کو بھی اور بکواس کرنے والوں کو بھی۔ مگر گاؤں کے لوگ بہت سیدھے ہوتے ہیں۔ جب جھوٹ بولنے والے حلفیہ کہنے لگے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مولوی صاحب کو فلاں کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ اور یہ بات بار بار کہی گئی۔ تو کچھ لوگ یقین کرنے لگے۔ آخری حد یہ ہوئی کہ اس بے حیا عورت نے جس کو اس کے شوہر نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا' چوہدریوں کے کہنے سے بک دیا کہ ہاں' مولوی قدرت اللہ اس سے ملنے آتے ہیں۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔ مگر زبان خلق جب نقارۂ خدا کی طرح گونجنے لگے تو کوئی کیسے نظر انداز کرے۔ نتیجہ یہ کہ مولوی قدرت اللہ کو مسجد کی امامت سے الگ کر دیا گیا۔ انہوں نے ایک کچا چبوترہ بنا کے نماز پڑھانی شروع کر دی اور کچھ لوگ ان کے پیچھے کھڑے ہونے لگے مگر وہ سب مشکل میں پڑ گئے۔ انہوں نے گھر پر درس کا سلسلہ شروع کیا تو گھر آنے والے بچوں کو مارا پیٹا گیا۔ بالآخر مولوی قدرت اللہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ ایک دن نماز جمعہ میں کھڑے ہو گئے اور وہ سب کہہ دیا جو ان کے دل میں غبار کی طرح بھرا ہوا تھا۔ وہ سب سچ تھا جو بیان کرتے ہوئے مولوی قدرت اللہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ لوگوں نے سر جھکا کے سب کچھ سنا مگر بے بسی کے ساتھ خاموشی سے سر جھکا کے نکل گئے۔ بہت تھوڑے سے لوگ تھے جنہوں نے رسماً انہیں تسلی دی کہ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ روز خاموشی سے گزر گئے لیکن یہ خاموشی کسی طوفان کی آمد کی خبر دیتی تھی۔ والد نے مجھے وصیت کرنے کے انداز میں بہت کچھ سمجھایا کہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو تمہیں کیا کرنا ہے۔ انہوں نے کہا' تم میری فکر مت کرنا۔ اپنی جان بچا کے نکل جانا اور کسی طرح شہر پہنچ جانا۔ انہوں نے مجھے ایک جاننے والے کا پتا بھی رٹوا دیا تھا۔ میں انہیں جانتی تھی اور دوبارہ امتحان دینے لاہور گئی تھی تو انہی کے گھر میں رکی تھی'' وہ پھر رونے لگی۔

ندیم نے اسے تسلی دی'' لو یہ پانی پی لو اور حوصلہ رکھو۔''

ایک گھونٹ پانی کا پی کے وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بات کرنے لگی'' پندرہ دن بعد ایک رات اچانک ہمارے گھر پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ ڈاکو نہیں تھے۔ ان میں سے ایک کا ڈھاٹا کھل گیا تھا تو میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ مجھے اٹھانے آئے تھے۔ ابا ان کی راہ میں دیوار بن گیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے ناپاک ہاتھوں سے بختاور کو چھونے سے پہلے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ مولوی صاحب' تم یوں چاہتے ہو تو یوں ہی سہی۔ دوسرے نے کلہاڑا اٹھایا تو مولوی صاحب نے کہا'' رکو ظالمو! مجھے کلمہ تو پڑھ لینے دو۔ اس کا ہاتھ رک گیا تو مولوی قدرت اللہ نے کہا۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کرے۔ تم باہر سے بھی کمزور اور مجبور لوگ ہو اور اندر سے بھی۔ کیا میں آخری بار اپنی بیٹی سے مل لوں۔ قاتل مطمئن تھے کہ بڈھا انہیں دھوکا دے کر کہاں جا سکتا ہے؟ ابا اندر میرے پاس آئے۔ مجھے گلے لگا کے چوما اور کہا کہ میں انہیں روکتا ہوں تو دیوار پھاند کے بھاگ جا۔ انہوں نے کچھ لوگوں کا نام لیا کہ ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنا۔ وہ تیری مدد ضرور کریں گے۔'' بختاور اب پھر رو رہی تھی۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد ندیم نے نرمی سے کہا ''کیا ان لوگوں میں میرا نام بھی شامل تھا؟''

بختاور نے اقرار میں سر ہلایا'' پہلا نام تمہارا ہی تھا۔ ابا نے زبردستی مجھے دھکیلا اور اپنی قسم دی تو میں نے انہیں خدا کو سونپا اور بھاگی۔ اندر کھڑے رہ کے میں نے گفتگو کا ہر لفظ سنا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ابا کا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ اور میں انہیں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی لیکن دوسرا مسئلہ میرے لیے زندگی اور موت سے زیادہ اہم تھا' مجھے ان وحشی درندوں سے خود کو بچانا تھا۔ میں بے آبرو ہو کے مرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ میں بھاگی۔ وہ صحن میں کھڑے تھے۔ میں سائے کی طرح ان کے سامنے سے گزر گئی۔ ان میں سے ایک نے چلا کے دوسرے سے کہا' اوئے' وہ نکل گئی۔ اس نے مجھے گالی بھی دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے پیچھے لپکتے' مولوی قدرت اللہ دوڑ کے ان کی راہ میں حائل ہو گئے اور ان کا راستہ روک لیا۔ میں جانتی تھی کہ مولوی قدرت اللہ ان شیطانوں کو ان کے عزائم سے باز رکھ سکتے تھے اور نہ ان کا راستہ روک سکتے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ میں راستہ دیکھے بغیر منہ اٹھائے بھاگتی گئی۔''

ندیم نے کہا' تم نے چیخ پکار نہیں کی۔ لوگ تمہاری مدد کے لیے آ جاتے۔''

''لوگ......!'' اس نے پرحقارت انداز میں کہا'' بزدل' بے ضمیر اور خود کو چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور سمجھنے والوں کا گروہ۔ جن کے نزدیک چوہدری' نعوذ باللہ خدا تھا۔ جو رزق اور موت پر قادر تھا۔ وہ اپنے بلوں میں دبکے پڑے رہتے۔ ان کے باہر آنے سے پہلے مولوی قدرت کو قتل کرنے والے آ جاتے اور ابا کے ساتھ میری عزت کا جنازہ بھی نکل جاتا جس

کی حفاظت کے لیے انہوں نے اپنی جان قربان کرنا منظور کیا تھا۔ ان کی قربانی رائیگاں جاتی' اس لیے میں جتنا تیز بھاگ سکتی تھی' بھاگی۔ میں رات سے' اندھیرے سے' جن بھوت کے خیال سے' کتوں سے' کسی سے نہیں ڈری۔ میری ٹانگوں میں نہ جانے کہاں سے اتنا دم آ گیا تھا کہ میں قبرستان کی طرف دوڑتی گئی اور پھر اس درخت پر چڑھ گئی جس کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں کہ اس پر جنات کا بسیرا ہے اور وہاں چڑیلیں رہتی ہیں۔ وہ برگد کا بہت پرانا اور بڑا درخت تھا جس کی شاخیں شاید پچاس گز میں پھیلی ہوں گی۔ اس کی داڑھی کہلانے والی شاخیں ہر طرف لٹک کر زمین میں جڑوں کی طرح پیوست ہو گئی تھیں۔''

''تمہیں درخت پر چڑھنا آتا ہے؟'' شہری بابو نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

وہ بولی'' گاؤں میں سب کو آتا ہے۔ میں اوپر چڑھ کے گھنے پتوں میں غائب ہو کے بیٹھ گئی۔ وہ ساری رات مجھے تلاش کرتے رہے۔ میں انہیں دیکھ بھی سکتی تھی اور ان کی آوازیں بھی سن سکتی تھی۔ وہ کلہاڑیاں کندھوں پر رکھے بڑی بڑی ٹارچوں کی روشنی میں جنگل کو اور قبرستان کو چھان رہے تھے مگر میں بالکل محفوظ تھی۔ پھر وہ گاؤں کی طرف چلے گئے۔ ممکن ہے وہ مولوی قدرت اللہ کے ہمدردوں اور دوستوں کے دروازے بجا کے ان سے کچھ پوچھتے رہے ہوں۔ مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ میں نیچے کیسے اتروں گی۔ میں تم تک پہنچنا چاہتی تھی مگر تم تو جانتے ہو' قبرستان گاؤں کے دوسرے کنارے پر ہے۔ میں رات بھر درخت پر ٹنگی رہی اور روتی رہی۔ پھر صبح ہو گئی۔ ہر طرف اجالا پھیل گیا تو وہ پھر مجھے ڈھونڈنے نکلے۔ ان سب کو پہچاننا تو مشکل تھا مگر وہ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ مشتعل اور پریشان غلام رسول نے ان سے کہا تھا کہ وہ گھوڑوں پر جائیں اور اردگرد کا سارا علاقہ دیکھیں۔ رات بھر میں وہ کتنی دور جا سکتی ہے۔ کس گاؤں میں پناہ لے سکتی ہے اور کس کے پاس۔ مجھے تلاش کرنے والے شہر جانے والی سڑک پر بھی گئے تھے۔ میں نیچے کیسے اترتی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ دوپہر کے بعد میں نے نذیراں کو دور سے گزرتا دیکھ لیا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے اوپر سے گلے کا پورا زور لگا کے اسے آواز دی۔ میری آواز نذیراں تک پہنچ گئی۔ وہ رکی اور چاروں طرف دیکھنے لگی اور پھر آواز کی سمت چل پڑی' جب وہ برگد کے قریب آئی تو میں نے پھر اسے آواز دی۔ اس نے منہ اٹھا کے اوپر دیکھا لیکن میں نظر نہ آئی۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ اوپر آ جا۔ جب وہ اوپر آئی تو میری حالت دیکھ کے بہت حیران ہوئی۔ میں اس کے گلے لگ کے خوب روئی اور میں نے اسے مولوی قدرت اللہ کے قتل اور غلام رسول کے شیطانی عزائم کے بارے میں سب کچھ بتایا۔ وہ بڑی بہادر لڑکی ہے۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ فکر مت کر۔ میں تجھے ڈاکٹر کے پاس پہنچا دوں گی۔ وہ رات کو میرے لیے کھانا پانی لے کر آئی۔''

ندیم نے کہا'' تم سارا دن بھوکی پیاسی درخت پر بیٹھی رہیں؟''

''اور میں کیا کرتی۔ نیچے شکاری کتے میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ اپنے والد کو یاد کر کے روتے روتے میری آنکھیں بھی خشک ہو گئی تھیں۔ ابا کی وصیت کے مطابق میں نے صبر اختیار کر لیا تھا مگر مجھے اپنے جذبات پر قابو ہی نہ تھا۔ تھکن سے میں الگ بے حال تھی۔ رات کو نذیراں آئی تو پیاس سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ نذیراں دو گھنٹے میرے پاس رہی اور اس نے مجھے بتایا کہ تم نے ابا کے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے کتنی کوشش کی تھی۔ تم نے انہیں دیکھا تھا۔''

''ہاں۔ انہوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر میرے پاس ریوالور تھا۔ میں نے ایک گولی چلائی تو وہ بھاگ گئے۔''

''ہاں۔ یہ بھی بتایا تھا نذیراں نے۔''

''اسے نذیرے نے بتایا ہو گا'' ندیم بولا'' وہ میرے ساتھ تھا۔''

''دوسری رات نذیراں نہیں آئی۔ چوبیس گھنٹے درخت کی شاخوں پر بیٹھے بیٹھے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ میرا سارا جسم اکڑ گیا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ نیند کا ایک جھونکا آیا تو میں نیچے جا گروں گی۔ ایک بار بچ گئی تھی۔ میرا سر سامنے والی شاخ سے لگا۔ اس سے یہ چوٹ بھی آئی۔''

ندیم نے اس کی اجلی پیشانی پر ایک زخم دیکھا جس پر خون جم گیا تھا۔ بھوک پیاس سے پھر میرا برا حال تھا۔ آدھی رات کے بعد میں نیچے اتری اور قبرستان میں چلی گئی۔ وہاں بہت سی پکی قبریں ہیں اور دو حجرے سے بھی بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو تقریباً گر گیا ہے۔ دوسرے میں مجھے پانی کا گھڑا مل گیا۔ اس میں نہ جانے کب کا پانی تھا مگر میں نے پی لیا۔ پھر میں حجرے کے ایک کونے میں سمٹ کر سو گئی۔''

''تم میری طرف بھی آ سکتی تھیں'' ندیم نے کہا۔

''کیسے آ سکتی تھی۔ ہر جگہ ہر طرف تو وہ مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ چوہدری غلام رسول بہت برہم تھا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تو مصیبت ہو جائے گی۔ پتا کرو وہ ہے کہاں۔ پولیس والوں نے غلام رسول کے کہنے پر نذیرے کو پکڑ لیا تھا۔''

''اسے میرا ساتھ دینے کی سزا ملی تھی۔ حالانکہ وہ بے چارا بے قصور تھا۔ اس نے تو میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔''

''اسی لیے نذیراں بھی نہیں آ سکی تھی۔ اس کے باپ نے سخت پابندی لگا دی تھی کہ خبردار جو گھر سے قدم باہر نکالا۔''

''وہ پھر بھی میرے پاس پہنچ گئی تھی'' ندیم نے کہا'' اپنے سونے کے کڑے دینے آئی تھی کہ رشوت میں تھانے دار کو دے کر نذیرے کو چھڑا لو۔ میں نے اسے واپس کر دیے کہ تو جا' میں نذیرے کو چھڑا لاؤں گا۔ میں نے تھانے والوں کو کچھ نہ دی' دو ہزار روپے رشوت دی اور نذیرے کو چھڑا لایا۔''

وہ تعریفی نظروں سے ندیم کو دیکھتی رہی'' مولوی قدرت اللہ کا تم پر اعتماد کرنا بالکل ٹھیک تھا' تم اچھے آدمی ہو۔''

ندیم نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔'' سوال یہ ہے بی بی کہ جو کچھ میں نے کیا ہے۔ اس کے سوا تمہارے لیے کیا کروں؟ میں اس وقت تمہیں اپنے ساتھ لے کر شہر نہیں جا سکتا۔ میں تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔ صبح نذیرا آ جائے گا۔ خیر اس کی تو کوئی بات نہیں' مگر نو بجے سے مریض آنے لگتے ہیں۔ تمہیں چھپانے کی کوئی جگہ بھی تو نہیں ہے میرے پاس۔ تمہاری حالت اتنی خراب ہو رہی ہے۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں مگر میرے پاس تو صرف اپنے کپڑے ہیں۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' وہ پرخوف معصومیت کے ساتھ بولی'' کیا واپس جا کے اسی درخت پر چڑھ جاؤں؟''

ندیم کو اس کی معصوم شوخی اچھی لگی'' میرے علاوہ بھی تو مرحوم مولوی قدرت اللہ نے تمہیں کسی کا نام بتایا ہو گا۔''

''دو نام اور بتائے تھے ابا نے۔ مگر مجھے نذیراں نے بتایا کہ انہیں چوہدری نے بلایا تھا اور سمجھا دیا تھا کہ مولوی قدرت اللہ کی بیٹی کو اپنے گھر میں چھپانے کی غلطی نہ کریں ورنہ ان کی خیر نہیں۔ وہ ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

ندیم نے چٹکی بجائی'' بس تو تم ان کے گھر چلی جاؤ۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا'' ان کے گھر کی ہر وقت نگرانی ہوتی ہے' اس کے علاوہ......''

''اس کے علاوہ کیا؟'' ندیم نے اسے غور سے دیکھا۔

''میں یہاں ٹھیک ہوں' میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔''

ندیم جھنجلا گیا۔'' بے وقوف لڑکی! یہ میرا گھر نہیں' اسپتال ہے۔ پتا ہے' کسی نے تمہیں دیکھ لیا یہاں تو کتنی باتیں بنیں گ[...] اور میں کوئی فلمی ہیرو نہیں ہوں' تمہیں بچانے کے لیے د[...] بندوں کو مار مار کے لٹا دوں۔ تم ایسا کرو' نذیراں کے گھر چل[ی] جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ اس وقت دیکھنے والا کو[ئی] نہیں۔ کل میں تمہیں کسی نہ کسی طرح شہر لے جاؤں گا۔''

وہ اپنی ضد پر اڑی رہی'' میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''مگر کیوں...... وہ سہیلی ہے تمہاری۔''

''اس کا ابا چوہدری کا چمچہ ہے۔''

ندیم بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس خیال سے اس پ[ر] وحشت سوار ہو رہی تھی کہ صبح ہونے میں اب صرف دو گھنٹے ر[ہ] گئے تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ مگر اس سے ندیم کا دماغ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ اس نے سوچنے کی کوشش بھی کی مگر اس کے تصور میں ہولناک مناظر آتے رہے۔ اس نے مولوی قدرت اللہ کی جگہ اپن[ی] لاش کو اسی پوز میں اسی جگہ پڑے دیکھا اور یہ دیکھا کہ اس کے قاتل بختاور کو ایسے لے جا رہے ہیں جیسے کوئی مرغی کو ذ[بح] کرنے کے لیے لے جاتا ہے۔ تڑپتی پھڑکتی' چیختی چلاتی بختاور اس مرغی سے بھی زیادہ بے بس تھی۔ وہ بختاور کو باہر نکال کے دروازہ بھی بند نہیں کر سکتا تھا کہ جاؤ' جہاں تمہارا جی چاہے' اپنے ساتھ مجھے کیوں مرواتی ہو۔ مگر یہ سوچنا ہی باعث شرم تھا۔ ایسا کرنے سے تو کہیں آسان حالات کا مقابلہ کرنا تھ[ا] خواہ وہ اتنے بھی برے کیوں نہ ہو جائیں۔

اچانک اسے ڈاکٹر امجد کا خیال آیا اور اس نے موبائل فون نکال کے اس کا نمبر ملایا' بس...... اگر ڈاکٹر امجد اسی وقت گاڑی لے کر آ جائے تو بختاور کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ ابھی ساڑھے چار بجے ہیں۔ وہ ساڑھے چھ یا سات بجے تک یقیناً پہنچ سکتا ہے۔ بختاور شہر پہنچ جائے گی اور اس کی جان کے دشمن جھک مارتے پھریں گے۔ ڈاکٹر صاحب پر الزام آنے کا کیا سوال...... وہ تو ہمہ وقت ڈسپنسری یا کلینک میں موجود تھے۔

مگر موبائل فون کی گھنٹی بجتی رہی' ایک بار...... دو بار...... دس بار...... ندیم مایوس ہونے لگا۔ عام طور پر لوگ موبائل کو بیڈ کے قریب اپنی دسترس میں رکھتے ہیں تاکہ رات کو فون آئے تو انہیں اٹھنا نہ پڑے مگر بعض اوقات آدمی موبائل فون کو گاڑی میں چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے کسی کمرے میں بھول جاتا ہے۔ ندیم کے اعصاب جواب دینے لگے۔ ابے اٹھ جا الو کے پٹھے۔ اس سے پہلے کہ قیامت آ جائے۔ فون چلا رہا ہے صور اسرافیل کی طرح اور تو مرا پڑا ہے۔

ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر اس نے فون بند کر دیا۔ شاید جس کی بیوی ڈاکٹر امجد کی بیوی کی طرح حسین اور پرکشش ہو وہ خواب وصل سے جاگنا ہی نہیں چاہتا۔

''تم نے کچھ سوچا۔'' وہ بختاور نے اسے پریشانی میں کمرے کے اندر گردش کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''اتنی دیر سے اور میں کیا کر رہا ہوں؟ طبلہ بجا رہا ہوں؟'' اس نے اتنے غصے سے کہا کہ بختاور ڈر گئی۔

''میں...... میں چلی جاتی ہوں'' اس نے دل شکستہ لہجے میں کہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکاتی اٹھی ''ابا نے تم پر غلط بھروسا کیا تھا۔''

وہ بختاور کے پیچھے لپکا ''خدا کے لیے۔'' وہ اسے پکڑ کے واپس بیڈ پر لے آیا اور زبردستی بٹھا دیا ''مجھے غلط مت سمجھو۔ اب یہ ناممکن ہے کہ میری زندگی میں کوئی تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے۔ یہ رونا دھونا بند کرو' ہمت سے کام لو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی بے ہودہ جگہ ہے یہ کہ یہاں سواری کوئی نہیں ملتی۔ اس وقت تانگا تو کیا بیل گاڑی تک نہیں ملے گی اور بس جائے گی شام کو۔ سائیکل بھی ہوتی میرے پاس تو میں تمہیں بٹھا کے لے جاتا۔ پیدل تو ہم جانے سے رہے۔''

بالآخر مسئلے کا حل اس پر فجر کی اذان کے کافی دیر بعد صبح سوا چھ بجے نازل ہوا جب روشنی پھیلنے لگی تھی اور وہ ہر طرح سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔

اس نے کہا ''بختاور۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں تمہیں ڈسپنسری میں بند کر دوں اور باہر سے تالا لگا کے خود کہیں دفع ہو جاؤں۔''

وہ سہم کے بولی ''کہاں؟ تم کہاں جاؤ گے۔''

ندیم نے اسے ڈانٹا ''جہنم میں۔ تمہیں اس سے کیا۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ میرے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے کنڈی لگاؤ۔ سوٹ کیس میں میرے دھلے ہوئے کپڑے رکھے ہیں۔ تمہارا دل چاہے پہن لو۔ تمہیں وہ سائز میں بھی بہت بڑے ہوں گے مگر دیکھنے والا کون ہے۔ اس کے بعد تم آرام سے سو جاؤ۔ سب سے پہلے نون سے نذیر آئے گا۔ باہر تالا لگا دیکھ کے وہ لوٹ جائے گا۔ لیکن اس بے وقوف سے کچھ بعید نہیں کہ وہ دروازہ بجائے۔ تم چپ کر کے پڑی رہنا۔ دس بجے تک سب کو معلوم ہو جائے گا کہ آج ڈسپنسری بند ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی کو کچھ بتائے بغیر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ایک بجے تک لوگ آتے رہیں گے۔ تم مزے سے اندر سوتی رہو۔ بھوک لگے تو سوائے دواؤں کے اندر جو ملے کھا لینا۔ جی چاہے تو چائے بنا لینا۔''

''تم کب آؤ گے؟''

''میں نہیں۔ میرا ایک دوست آئے گا۔ اس کا نام ہے ڈاکٹر امجد۔ ابھی میں اسی کو فون کر رہا تھا مگر وہ سو رہا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی سے نہ وہ جاگا نہ اس کی بیوی اٹھی۔ میں انہیں پھر فون کروں گا۔ دس بجے کے قریب۔ میرا خیال ہے بارہ ایک بجے کے قریب وہ اپنی کار لے کر آئے گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔''

''میں اسے نہیں جانتی...... میں کسی اجنبی کے ساتھ نہیں جاؤں گی'' وہ پرخوف لہجے میں بولی۔

''اسے تم ایسے ہی سمجھو...... جیسے میں ہوں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر امجد کی بیوی بھی ساتھ آئے گی۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی ''لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا......؟''

''جب وہ دستک دے گا تو باہر سے اپنا نام بتائے گا۔''

''اور تم...... تم کب آؤ گے؟''

ندیم نے کہا ''میری فکر مت کرو۔ کیا پتا میں تم سے پہلے ڈاکٹر امجد کے گھر پہنچ جاؤں۔ ورنہ شام تک کسی وقت بھی آ جاؤں۔''

''اور شام تک کہاں رہو گے تم؟''

وہ اس کی جرح سے جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا ''یار' یہ تم سوال پر سوال کیوں کرتی جا رہی ہو؟ جیسا میں کہہ رہا ہوں کرو۔''

''وہ...... دراصل۔ ایک خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا'' وہ متاثر ہوئے بغیر بولی۔

ندیم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ''بولو۔''

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ باہر سے دروازے کو تالا لگاؤ اور کھڑکی سے اندر آ جاؤ۔ پھر ہم کھڑکی اندر سے بند کر لیں گے اور جب جانا ہوگا تو کھڑکی سے نکل جائیں گے۔''

ندیم نے خود کو خاصا احمق محسوس کیا۔ یہ بہت آسان تھا اور بے خطر بھی۔ ''یو آر رائٹ! اٹ از سو سمپل'' ایک گاؤں کی لڑکی اور مولوی قدرت اللہ کی بیٹی سے انگریزی بولتے ہوئے کچھ عجیب سا لگا۔

نذیر ساڑھے آٹھ بجے آیا اور غالباً دروازے پر تالا دیکھ کے اسے شاک پہنچا۔ ''یہ ڈاکٹر صاحب کدھر چلے گئے صبح صبح!'' اس نے تالا ہلا کے کہا اور پھر کسی وجہ کے بغیر دروازہ بجانے کی حماقت بھی کی۔ ندیم نے اسے اندر سے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کے دیکھا۔ وہ برآمدے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ایک گنا چوسنے کے عمل کا آغاز کر رہا تھا۔ وہ وفادار اور مستقل مزاج شخص دس بجے تک وہیں قیام پذیر رہا اور آنے جانے والوں کو شرمندہ کرتا رہا کہ کیا تالا نظر نہیں آ رہا ہے؟ آنکھوں میں مرچیں کا سرمہ ڈالو۔ ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں۔ کہاں گئے ہیں؟ اپنے سسر کی شادی میں گئے ہیں۔ کب واپس آئیں گے۔ جب اللہ کو منظور ہوگا۔ ان کی بیٹی ہوگی پھر وہ جوان ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب اس سے شادی کریں گے لڑکی کا باپ ان کا سسر بنے گا۔ اس کے بعد ہی آئیں گے۔ لوگ اسے گالیاں دے کر جاتے رہے۔ حسب ضرورت اس نے بھی خواہش مندوں کو گالیوں سے نوازا۔ گاؤں میں گالی دینا قربت کی علامت تھی۔ اس میں رشتے یا بزرگی کے لحاظ کو دخل نہیں تھا۔

دس بجے کے بعد نذیر بھی چلا گیا تو ندیم نے سکھ کا سانس لیا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ باہر اب کوئی نہیں تھا۔ اس نے بختاور کو حکم دیا کہ وہ پردے کا کونا تھام کے باہر نظر رکھے اور کوئی قریب آئے تو فوراً خبردار کرے۔ پھر اس نے ڈاکٹر امجد کا فون ملایا۔ وہ سو کے اٹھ چکا تھا اور اب ناشتا کر رہا تھا۔

''میں نے صبح ساڑھے چار بجے بھی فون کیا تھا۔''

امجد اسے ڈانٹنے لگا ''کیوں کیا تھا؟ اتنی تمیز نہیں کہ شادی شدہ لوگوں کو آدھی رات کو فون نہیں کرتے۔''

''یار' میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

ڈاکٹر امجد نے اطمینان سے جواب دیا ''کوئی بات نہیں۔ آدمی پیدائش کے وقت مصیبت میں پڑتا ہے تو مرنے کے بعد تک مصائب میں ہی مبتلا رہتا ہے۔ دعا کرو اور اللہ سے خیر مانگو۔''

''یار' اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟''

''پورا منظر تو بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میں بیک وقت کئی کام کر رہا ہوں۔ سانس لینے سے بیوی کی طرف بری نظر سے دیکھنے تک۔''

''یار خدا کے لیے سیریس ہو جاؤ۔ تمہیں فوراً یہاں پہنچنا ہے'' ندیم نے جھلا کے کہا۔

''اچھا اچھا۔ آرام سے بتا' آخر ہوا کیا ہے؟''

ندیم نے اسے پوری بات بتائی جو اس نے بڑے تحمل سے سنی اور پھر اسے ڈانٹنے لگا۔ ''یاد ہے' میں نے کیا وصیت فرمائی تھی تمہارے آخری سفر سے پہلے؟ کہ بیٹا' کسی گاؤں کی گوری کے چکر میں مت پڑنا۔ گاؤں میں وہ سب نہیں ہوتا جو وی سی آر اسکرین پر ہوتا ہے۔''

''یار' میں کسی کے چکر میں نہیں پڑا۔''

''بکواس مت فرمائیے۔ اس بدبخت آور سے پہلے وہ کیا تھا۔ چھوٹی چوہدرائن کا عشق۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' ندیم نے جز بز ہو کے کہا ''ابھی اس مصیبت سے بھی جان نہیں چھوٹی'' وہ کہتے کہتے رک ... کہ یہ نئی آ گئی۔

''یہ سب تقدیر کے چکر ہیں بیٹے!''

ندیم نے اسے ایک گالی دی ''اُلو کے پٹھے! یہ ... تیرے چلائے ہوئے چکر ہیں۔ تیری باتوں میں آ کے ... بانس پر چڑھ گیا اور اب بیٹھا ہوں اس کی نوک پر۔''

'اچھا اچھا' میں آ رہا ہوں'' ڈاکٹر امجد ہنسنے لگا ''ویسے ... بانس کتنا لمبا ہے؟'' اس نے فون بند کرنے سے پہلے با... کے بارے میں ایک ناقابل اشاعت بات بھی کی۔

بختاور نے ندیم کا ایک دھلا ہوا شلوار قمیص پہن لیا تھا ... اس کے سائز سے بہت بڑا تھا چنانچہ اس نے آستینوں کو او... تک پلٹ لیا تھا اور شلوار کو اوپر اڑس کے اس کی لمبائی کو ... کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس کے باوجود اس مردانہ ڈھ... ڈھالے لباس میں وہ بہت مضحکہ خیز اور مختصر لگ رہی تھی ... ڈاکٹر امجد سے گفتگو کے دوران میں وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ... خود کو سمیٹے بیٹھی رہی تھی اور ایک بار مسکرائی بھی تھی۔

''یہ کون تھا؟'' وہ بولی۔

''یہ تھا فرشتۂ غیب۔ ابھی دو گھنٹے میں نمودار ہوگا اور بس ... ایسے نکال لے جائے گا جیسے...... '' اسے کوئی مثال ... سوجھی۔

دودھ ہر صبح نذیر لے کر آتا تھا جو آج وہ واپس لے گیا تھ... چنانچہ ندیم نے کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر چائے بنائی اور اسے ... پی۔ بختاور نے اس کڑوے سیاہ زہر کو پینے سے صاف انکا... کر دیا۔

''اس سے تو کلیجہ جل جائے گا میرا۔''

ندیم نے مزے سے ایک چسکی لی ''کلیجہ مردوں کا ہو... ہے۔ تم کلیجی کہہ سکتی ہو۔''

وہ پہلی بار کھلکھلا کے ہنسی۔

ندیم نے سر پر ہاتھ مارا ''تم مرواؤ گی۔ باہر کسی نے ... گھنگھروؤں کی جھنکار سن لی تو نہ جانے کیا سمجھے گا۔''

''گھنگھروؤں کی جھنکار'' وہ حیران ہو کے بولی۔

''میرا مطلب تھا تمہاری ہنسی کی آواز۔ اور خدا کے لیے ... یہ بال باندھ لو۔ ازار بند کاٹ لو میرا۔ بہت لمبا ہوگا تمہیں۔''

وہ شرما کے ہنسی ''بال تو ایسے ہی رہتے ہیں میرے۔''

''ہاں' مگر تم بار بار انہیں ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی ہو تو ... چوڑیاں کھنکتی ہیں۔ ہم پکڑے گئے تو پتا کیا ہوگا؟''

وہ نظر جھکا کے بولی" پتا ہے۔"

اس کے بعد وہ سرگوشیوں میں بات کرتے رہے۔ وہ ندیم کو مولوی قدرت اللہ کے بارے میں بتاتی رہی جس کے بارے میں اسے یقین کامل تھا کہ وہ شہادت کے منصب پر فائز ہوا چنانچہ جنت میں ہے۔

حسب توقع ڈاکٹر امجد دو گھنٹے بعد نمودار ہوا تو دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ اب کسی مریض کے آنے کا امکان بھی نہیں رہا تھا مگر ڈاکٹر امجد نے دستک دی تو ندیم نے احتیاطاً کھڑکی کا پردہ ہٹا کے جھانکا اور پھر کھڑکی کھول دی۔" تشریف لائیے" لیکن ڈاکٹر امجد اکیلا نہیں تھا۔ گاڑی سے اتر کے اس کی حورشمائل بیوی بھی بڑی نزاکت سے آرہی تھی چنانچہ ندیم نے دروازے کے تالے کی چابی دی۔

ڈاکٹر امجد نے اندر آتے ہی سب سے پہلے بختاور کو دیکھا۔" تو یہ ہیں وہ...... خاتون" غالباً وہ مصیبت کہتے کہتے رک گیا۔

ندیم نے کہا" زندگی میں پہلے کبھی تمہاری صورت دیکھ کے اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہے تم آگئے ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔"

" تم ایک برات اپنے پیچھے دیکھتے کیونکہ تمہارا توے کی سیاہی سے کالا چہرہ ادھر ہوتا جدھر گدھے کی دم کے نیچے......"

اس کی بیوی نے اسے ڈانٹا" کیا فضول بولے چلے جارہے ہو۔ دیکھتے نہیں لڑکی کتنی مصیبت زدہ ہے" اس نے بختاور سے ہاتھ ملا کے کہا" میں ڈاکٹر امجد کی بیوی ہوں شہناز۔ لو یہ کپڑے پہن لو میں تمہارے لیے لائی تھی۔ چلو اٹھو دیر مت کرو۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے" بختاور خاموشی سے اٹھی اور کپڑے بدلنے چلی گئی۔

" عجب خدا کی قدرت ہے" ندیم بولا" تیری بیوی تو حسین ہونے کے ساتھ ساتھ عقلمند بھی ہے۔"

شہناز اپنی تعریف پر خوش ہوئی" خوبصورت تو یہ بھی بہت ہے، بختاور۔"

ڈاکٹر امجد نے کہا" سچ کہتی ہو۔ جی تو میرا بھی چاہنے لگا ہے کہ تمہیں چھوڑ دوں اور اس سے شادی کرلوں۔"

ڈاکٹر امجد نے سچ کہا تھا۔ جب بختاور نے وہ جوڑا پہنا جو شہناز اپنے ساتھ لائی تھی تو ندیم اسے دیکھتا رہ گیا اور اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک شہناز نے شوخی سے اس کا کان پکڑ کے نہیں کھینچا" چلو نکلو" مگر اس وقت تک بختاور کا گلابی رنگ لال ہوگیا تھا۔

☆☆☆

ندیم یوں تڑپ کے بستر سے نکل گیا جیسے اس کے بستر میں سانپ گھس آیا ہو۔" پھر وہی حرکت۔ خدا کے لیے نسرین! مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔" اس نے لائٹ آن کردی

نسرین اسے مجروح اور شکست خوردہ نظروں سے دیکھتی رہی" کیا میں چھوٹی چوہدرائن سے بھی بری ہوں؟"

ندیم نے غیر جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا" اپنا موازنہ چھوٹی چوہدرائن سے کرکے خود کو رسوا مت کرو۔ وہ گندے پانی کا نالہ ہے جس میں ہر گھر کی غلاظت شامل ہوتی ہے۔ تم سیل بند منرل واٹر کی فریج میں رکھی ہوئی ٹھنڈی بوتل ہو جو صرف میرے لیے ہے۔"

ایسا پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔ نسرین موقع پاتے ہی اس کے جذبات کے آتش گیر مواد میں سلگتی ہوئی چنگاری پھینکنے کی کوشش کرتی تھی اور وہ آگ بھڑکنے سے پہلے ہی اسے بے حسی کی برف سے ٹھنڈا کردیتا تھا۔ اس کے بعد ان کا جذباتی ردِعمل بھی ہمیشہ وہی ہوتا تھا۔ ندیم اس شخص کی طرح محسوس کرتا تھا جس نے سانپ کو ڈسنے کا موقع ہی نہیں دیا اور خود کو اس کے زہرناک اثرات سے بچالیا۔ نسرین زخم خوردہ ناگن کی طرح احساسِ ذلت کا شکار ہوکے بے بسی کے کرب میں بل کھاتی رہ جاتی تھی۔ پھر ندیم میٹھی میٹھی باتیں کرکے اسے بے وقوف بناتا تھا اور وہ نارمل ہوجاتی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ نسرین نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کے اس کی آنکھوں میں جھانکا" ندیم! تمہیں پیاس نہیں لگتی؟"

ندیم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا" پیاس...... ! دراصل اس معاملے میں تم مجھے ایک اونٹ سمجھ سکتی ہو جس کے بارے میں اپنے علامہ اقبال صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے کہ اونٹ ہے صحرا میں اور بیرون صحرا کچھ نہیں۔ تو میں بھی زندگی کے صحرا میں بھٹکتا ہوا ایک اونٹ ہوں جو پانی کے بغیر رہ سکتا ہے۔ صحرائی جہاز۔"

" پتا نہیں کیا بولتے چلے جارہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ پیاس بجھانے کے لیے گاؤں میں کنوئیں بہت ہیں۔ پنگھٹ ہیں اور گاگر سے پانی پلانے والیاں ہیں۔"

ندیم نے ایک مصنوعی آہ بھری" میرا مطلب کچھ اور تھا۔ شہر کے مقابلے میں وہ گاؤں ایک صحرا ہے جہاں میں اپنی زندگی کے دن قید بامشقت کی طرح کاٹ رہا ہوں۔"

" کس نے کہا ہے تم سے اس قید میں رہنے کو......"

" مجبوریاں' میری جان! مجبوریاں۔ تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے۔ لوگ تو اس سے بھی آگے گئے

ہوئے ہیں پیسا کمانے۔ دبئی اور سعودی عرب اور کویت۔ جہاں دھوپ گرمی ریت اور غلامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے بھی بہت پیسا کمانا ہے۔ جو میں یہاں لاہور میں نہیں کما سکتا۔''

''کیا کرو گے آخر تم اتنے پیسوں کا؟''

''میں...... میں ایک شاندار مرسیڈیز خریدوں گا تمہارے لیے' ایس ایل 300۔ آٹو میٹک' ائرکنڈیشنڈ۔ اور ایک محل بناؤں گا رحیم یار خاں میں سلطان زید کے محل جیسا' تمہارے لیے لیکن جانتی ہو ابھی میں کہاں رہتا ہوں؟ ایک کچی کوٹھری جیسے کمرے میں۔ اس کے آگے ایک چھوٹا سا صحن ہے' جس پر میں چارپائی ڈال کے سوتا ہوں تو رات بھر بھڑ جیسے مچھر مجھے کاٹتے ہیں اور میرا خون پیتے ہیں۔ میرا خیال ہے میرے جسم میں اب خون برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ اس کچی کوٹھری کے ایک کونے میں چولھا جلا کے میں اپنا کھانا خود پکاتا ہوں۔ ابلی ہوئی دال اور کچی پکی روٹیاں۔ اور وہاں باتھ روم بھی کوئی نہیں ہے۔ صبح منہ اندھیرے مجھے باجرے کے کھیت میں جانا پڑتا ہے۔ غالباً اسی لیے مادام نور جہاں نے اور بعد میں انجمن نے باجرے کے کھیت کی رکھوالی سے انکار کر دیا تھا۔ میں جوہڑ میں بھینسوں کے ساتھ نہاتا ہوں' کیا تم پر رقت طاری ہوئی؟''

نسرین کا منہ اپنے محبوب کی دکھ بھری زندگی کی یہ تصویر عبرت دیکھ کے سچ مچ دکھی ہو گیا تھا ''خدا کے لیے ندیم! ایسے کب تک زندگی گزارو گے اور یہ بھی کوئی زندگی ہے؟''

''سچ کہا تم نے۔ اور اسی لیے اب میں نے سوچا ہے کہ خالہ جان سے فائنل بات کر لوں۔''

''کس معاملے میں؟'' وہ جانتے بوجھتے انجان بننا چاہتی تھی مگر اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔

''یہی کہ اب میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ چٹ منگنی تو ہو ہی چکی ہے۔ پٹ بیاہ فرما کے کہہ دیں کہ چاندنی بنواب تیرے حوالے۔''

نسرین اٹھ بیٹھی ''تم مجھے اپنے ساتھ اس گاؤں میں لے جانا چاہتے ہو' اس کچی کوٹھری میں......؟''

''اور کہاں لے جاؤں گا؟'' ندیم معصومیت سے بولا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔''

''کیوں۔ شوہر کا گھر جیسا بھی ہو' بیوی کی جنت ہوتا ہے۔ جہاں اس کی ڈولی جاتی ہے تو جنازہ نکلتا ہے'' ندیم نے تمام اصلاحی ناولوں اور سوشل فلموں کے ڈائیلاگ استعمال کیے ''میاں بیوی دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا مرتے دم تک ساتھ دیتے ہیں۔ محبت کرنے والے محل میں بھی اتنے ہی خوش رہتے ہیں جتنے جھونپڑی میں اور مجھے پتا ہے' تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تم میرے ساتھ جھونپڑی تو کیا جیل میں بھی خوش رہ سکتی ہو۔''

حسب توقع نسرین نے چراغ پا ہو کے کہا ''اور وہ جو تم میرے لیے محل اور مرسیڈیز کی بات کر رہے تھے؟''

ندیم نے سادگی سے کہا ''محل بھی گاؤں میں ہو گا۔ مرسیڈیز بھی وہیں ہو گی انشاء اللہ۔ بس اس کے لیے حوصلے' مستقل مزاجی اور صبر سے کام لینا ہو گا۔''

''کتنے دن؟'' نسرین تلخی سے بولی۔

''زیادہ دن نہیں۔ یہی دس بیس سال۔''

نسرین چراغ پا ہو کے بولی ''آخر تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟ میں اتنی پاگل ہوں کہ لاہور جیسا شہر چھوڑ کے دس بیس سال تمہارے ساتھ اس گاؤں میں جانوروں سے بدتر زندگی گزار لوں گی۔ بھینسوں کے ساتھ نہاؤں گی اور باجرے کے کھیت میں جاؤں گی......''

جب وہ دل کھول کے بکواس فرما چکی تو ندیم نے اسے دیہی زندگی کی سادگی' پرسکون' صحت بخش آب و ہوا اور گاؤں کے لوگوں کی پرخلوص معصومیت کے علاوہ خدمت خلق اور ثواب دارین کے بارے میں اپنے منافقانہ خیالات پر مبنی ایک ایسا لیکچر دیا جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ فوری طور پر نسرین اس کی محبت پر' اس پر اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خیال پر اعلانیہ لعنت بھیجتی ہوئی واک آؤٹ کر گئی۔ فہو المطلوب۔

اگلے دن محاورے کے مطابق خالہ نے اس کے خوب لتے لیے مگر ندیم اپنے پاکیزہ' اعلیٰ و ارفع خیالات پر قائم رہا کہ وہ اپنی بقیہ عمر اسی گاؤں میں دکھی انسانیت کی خدمت کرتے گزارنے کا عہد کر چکا ہے اور شرعاً و قانوناً اس کی منکوحہ صبر و شکر کے ساتھ اپنے مجازی خدا کے گھر میں ہنسی خوشی رہنے کی پابند ہے۔ خالہ کے لیے باجرے کے کھیت اور بھینسوں کے سوئمنگ پول اور ایک کچی کوٹھری کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔

خود خالو محترم نے دلائل کی رو سے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ جتنی رقم اس کے پاس ہے' اس سے وہ شہر میں کتنے باعزت کاروبار کر سکتا ہے اور خدمت خلق کرنا چاہے تو اس کے مواقع بھی شہر میں کم نہیں' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔ کسی دلیل سے ندیم کے موقف میں لچک پیدا نہیں ہوئی۔ وہ باقی عمر ساجن پور میں گزارنے کے موقف پر ڈٹا رہا۔

نتیجہ بالآخر اس کی توقعات کے عین مطابق نکلا۔ نہ صرف یہ کہ نسرین نے اس سے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ بلکہ خالہ کی طرف سے بھی سرکاری بیان جاری کر دیا گیا کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی تیل کے کنوئیں میں دھکا دے دیں گی مگر ندیم سے اس کی شادی نہیں کریں گی۔ کون بھانجا' کس کا بھانجا۔ چلو اٹھاؤ اپنا سامان اور نکلو یہاں سے پاگل کے پتر۔

ندیم اس سلوک پر خوشی سے بغلیں بجاتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا اور ڈاکٹر امجد کے گھر پہنچا تو شہناز لان کے سبز قالین پر پڑی سفید کرسی پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

اس نے پیچھے سے نعرہ لگایا ''بھابی...... یوریکا...... یوریکا۔''

اور جب اس نے چائے کا کپ لبوں سے ہٹا کے پیچھے دیکھا تو ندیم کو احساس ہوا کہ وہ شہناز نہیں بختاور ہے۔ اس کی سٹی گم ہو گئی ''اوہ...... معاف کرنا......''

بختاور مسکرائی ''ایسا کیا پا لیا تم نے کہ ارشمیدس کی طرح چلاتے بھاگے چلے آ رہے ہو۔ شکر ہے کپڑے پہننا یاد رہا تمہیں۔ وہ تو غسل خانے سے ایسے ہی نکل کے شاہی دربار پہنچ گیا تھا۔''

ندیم [illegible] مولوی قدرت اللہ مرحوم کی گاؤں میں رہنے والی بیٹی سے یہ توقع ہرگز نہیں رکھتا تھا کہ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ لے گی۔ اس کی جگہ نسرین ہوتی تو شکل پر بے وقوفی اور کم عقلی کے سارے جذبات طاری کر کے یہ سوال ضرور کرتی کہ یوریکا کیا بلا ہے؟

مزید غضب یہ ہوا کہ عین اسی وقت اندر سے شہناز نمودار ہوئی اور اس نے بھی پوچھ لیا ''کیا ہو گیا ڈاکٹر صاحب! بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔ کون سا گوہر مراد پا لیا؟''

ندیم نے ایک گہری سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گیا ''وہ...... دراصل' میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ میری منگنی ٹوٹ گئی۔ کیا کہتے ہیں اسے' ٹھیکرے کی منگنی۔ خالہ نے جوتے مار کے مجھے گھر سے نکال دیا۔''

وہ دونوں ہنس پڑیں ''اور تم اس پر خوش ہو؟''

''اگر تمہاری جان اس بن مانس سے چھٹ جائے تو تمہیں خوشی نہیں ہو گی؟'' ندیم نے کہا۔

''کون بن مانس!'' شہناز نے آنکھیں نکالیں۔

''اب نام کیا لوں اس کا' تم سمجھ تو گئی ہو۔''

''آنے دو ابھی امجد کو۔ بتاتی ہوں کہ تم اسے کیا سمجھتے ہو۔''

ندیم سر کھجانے لگا ''بھابی۔ بس آج کی رات اپنے غریب خانے پر گزار لینے دو۔ صبح میں بس سے دفع ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد بتانا۔''

رات کو کھانے کے بعد ندیم اور ڈاکٹر امجد لان چیئرز پر بیٹھ گئے۔ شہناز اور بختاور اس وقت اسٹار پلس سے آنے والے ساس بہو کے ایک ڈرامے میں یکساں انہماک کے ساتھ غرق تھیں۔ ڈاکٹر امجد نے ایک بوتل سے اپنے لیے جام بھرا ''تم بھی پیو۔''

ندیم نے معذرت کی ''میں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ لسی پیتا ہوں' وہ بھی نہار منہ۔''

''در فٹے منہ'' امجد نے کہا۔

''تمہاری بیوی کچھ نہیں کہتی' شراب پینے پر؟''

''وہ خود شراب کی بوتل ہے۔ وہ کیا کہے گی۔''

''ڈاکٹر صاحب' میرے لیے گاؤں میں زندہ رہنے کے امکانات معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر بلا مجھ پر بھی نازل ہوتی ہے۔ تمہیں میری زندگی کی حفاظت کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔''

''یہ جینا بھی کوئی جینا ہے للو!'' امجد نے ایک مشہور فلمی ڈائیلاگ دہرایا ''مگر خیر...... مجھے بتاؤ' میں تمہارے لیے کیا کروں؟ تمہاری لائف انشورنس کرا دوں دس لاکھ کی؟ وارث خود بن جاؤں؟ میں توپ لگوا دوں تمہارے گھر کے سامنے؟''

''ڈاکٹر صاحب! مذاق کی بات نہیں اور اس میں بھی کوئی شک کی بات نہیں کہ جب آپ نے مجھے ایک آفر دی تھی تو رسک میں نے لیا تھا۔''

''میں بھی اس جرم میں برابر کا شریک تھا۔''

''ہاں۔ مگر گاؤں میں جن عملی خطرات کا سامنا ہو سکتا تھا' اس کا ہدف صرف میں تھا۔ میں ان خطرات کو اچھی طرح سمجھتا تھا چنانچہ اپنی تقدیر کے ساتھ جوا کھیلا تھا تو میں نے۔ بعد میں اگر وہ خطرات ایک حقیقت بن کے سامنے آ گئے تو یہ میری بدقسمتی یا بے وقوفی۔ آپ کا تو کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ سرکاری خرچ پر نہ گئے' اپنے ذاتی خرچ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر نکل جائیں گے۔''

''برخوردار! تم بہت سیریس ہو رہے ہو۔''

ندیم نے اپنی بات پر زور دے کر کہا ''یہ معاملہ سیریس ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم نے مجھے مصیبت میں ڈالا تھا۔ اب تم ہی مجھے مصیبت سے نکالنے کے پابند ہو۔ میں یہ کہتا ہوں کہ میں آپ کی مدد کر رہا ہوں' بے شک اپنے فائدے کے لیے

آپ بھی اپنے فائدے کے لیے میری مدد کریں۔"

ڈاکٹر امجد نے ایک جام اور بھرا "تم DEBATOR رہے ہو کالج کے زمانے میں؟"

"نہیں...... مگر میں بحث نہیں کرر ہا ہوں۔"

"تم بڑے اچھے وکیل بن سکتے تھے۔" ڈاکٹر امجد نے کہا "میری عدالت میں تم نے اپنا موقف بہت اچھی طرح پیش کیا اور مقدمہ جیت گئے۔ اب فرماؤ' تم مجھ سے کیا مدد چاہتے ہو۔ دراصل ابھی تو صرف تین مہینے گزرے ہیں اور تمہیں معاہدے کی رو سے وہاں کم از کم ایک سال گزارنا ہے۔ ظاہر ہے' اس کے لیے تمہارا زندہ ہونا بھی ضروری ہے۔"

"بات صرف ایک سال کی نہیں۔ شاید اس کے بعد بھی میں ساجن پور سے واپس نہ آسکوں۔ شاید میری باقی زندگی وہیں گزر جائے۔"

"اوہ...... یہ معاملہ ہے" ڈاکٹر نے جام خالی کر دیا "ایک بات پوچھوں' سچ سچ بتایئے گا؟"

"پوچھو۔"

"یہ جو مولوی قدرت اللہ کی لڑکی ہے' بختاور...... تجھے اس سے عشق تو نہیں ہو گیا؟"

"لاحول ولاقوۃ۔ وہ ایک ستم رسیدہ لڑکی ہے' جس کی میں نے مدد کی کیونکہ میں مجبور ہو گیا تھا۔"

"عشق ایسے ہی کسی اتفاق سے اسٹارٹ ہوتا ہے بیٹے اور پھر آدمی اس سے بھی زیادہ مجبور ہو جاتا ہے۔" وہ آہ بھر کے بولا "ایک سو ایک عشق کیے' شادی صرف ایک کی اور پھنس گئے ورنہ ایک سنچری اور کرتے ولایت جا کے' میموں سے۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ بیوی میری اماں بن کے ساتھ جائے گی کہ بچہ کہیں بگڑ نہ جائے...... خیر' بختاور اچھی لڑکی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"تمہیں بالآخر اس سے عشق ہو جائے گا اور تقدیر کے ستاروں کی چال سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہی تمہیں گود لے گی۔ اپنے بچوں کا باپ بنانے کے لیے" ڈاکٹر امجد ہنسا۔

"فضول بکواس کا یہ کون سا موقع ہے' مجھے بتاؤ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"

"کس سے...... سسرال سے...... یا اللہ میاں سے......؟"

"تم اپنے تعلقات سے میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"ویری گڈ سوال" ڈاکٹر امجد پر اب تھوڑا تھوڑا مے کا اثر غالب آنے لگا تھا "میرا سالا ایس پی ہے' قمر الزماں۔"

ندیم اچھل پڑا "کیا نام لیا تم نے؟"

"قمر الزماں...... اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔"

ندیم ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس نے ڈاکٹر امجد کو ساری بات بتائی "میں ایک فرضی ایس پی قمر الزماں کی دھمکی دیتا رہا تھا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔"

"یہ ایک فلمی اتفاق ہے لیکن کچھ اتفاقات حقیقی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔ اس وقت تو وہ ملے گا نہیں" ڈاکٹر نے گھڑی دیکھی "اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی نا۔"

"تم اس کو سارا معاملہ سمجھا دینا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی اسے فون کر دوں اور وہ سچ مچ پولیس کی وردی میں اپنی پلٹن کے ساتھ ساجن پور آ جائے' صرف ایک بار؟"

"آئے گا کیسے نہیں۔ اس کی تو...... تو بہن......" ڈاکٹر امجد کو اس لیے خاموش ہونا پڑا کہ مذکورہ خاتون باہر آ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ بختاور بھی تھی اور غالباً ڈرامے کے آخری دردناک منظر نے دونوں پر رقت طاری کر رکھی تھی۔

بختاور سحر خیز تھی۔ وہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی ہو گی اور پھر کچھ دیر تلاوت کرتی رہی تھی۔ گھر کے سارے مکین سوئے پڑے تھے۔ وہ خاموشی سے کچن میں گئی اور اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ اسے صبح دم چائے پینے کی عادت نہیں تھی مگر ڈاکٹر امجد کے گھر میں کسی وجہ کے بغیر وہ ایک معمول کی عادی ہونے لگی تھی۔ چائے لے کر وہ لان پر ٹہلتی رہتی تھی۔ اپنے ننگے پیروں میں شبنم کی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتی جاتی تھی اور صبح کی جانفزا تازگی کو سانسوں میں جذب کرتی جاتی تھی۔

ندیم نے اسے کھڑکی کے شفاف شیشوں پر تیرتے ہوئے پردوں کی ایک درمیانی درز سے دیکھا۔ وہ دوبارہ ایک رنگین غبار کی طرح لہرائی اور غائب ہو گئی۔ ندیم نے پردہ ہٹا کے دیکھا اور اس منظر سے مسحور ہو کے رہ گیا۔ درختوں کی ہریالی' سبزے کی شادابی اور گملوں سے بجی اس تصویر حسن کا سب سے حسین رنگ اس پیکر محبوبی کا تھا جو باد نو بہار کی طرح چمن میں محو خرام تھا۔ ندیم کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ گاؤں کی دیہی لڑکی اور مولوی قدرت اللہ کی بیٹی ہے۔ جسے اس نے پہلی بار خستہ تن اور وحشت زدہ۔ پھٹے کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ کسی بھٹکی ہوئی بدروح کی طرح دیکھا تھا۔

وہ اپنے دوسری منزل کے بیڈ روم سے نکلا اور سیڑھیاں اتر کے صدر دروازے سے لان پر پہنچ گیا۔ بختاور اسے دیکھ کے مسکرائی۔

ندیم اس کے ساتھ چلنے لگا "صبح صبح اکیلے چائے پی رہی ہو۔"

"تم بھی پیو گے؟ میں ابھی لاتی ہوں" ندیم کے روکنے کے باوجود وہ اندر غائب ہو گئی۔ ندیم اکیلا گھاس پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ ڈاکٹر امجد کی گزشتہ رات کی پیش گوئی کہیں سچ تو نہیں ہو جائے گی۔ چند منٹ بعد بختاور چائے کا ایک اور مگ لیے نمودار ہوئی۔

"تم بیڈ ٹی لیتی ہو' کمال ہے" ندیم اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"میں نے ایسی کوئی علت نہیں پالی" وہ ندیم کے ساتھ چلنے لگی "مگر یہاں سب بہت دیر سے سو کے اٹھتے ہیں۔ ناشتا بھی بہت دیر سے ہوتا ہے۔"

ندیم نے پھر کہا "کمال ہے' چائے تم نے بالکل ویسی ہی بنائی ہے جیسی میں پیتا ہوں' بہت کم دودھ والی۔"

"تم آج ساجن پور جاؤ گے؟"

"ہاں۔ تمہارا آئندہ پروگرام کیا ہے؟"

"پروگرام بنانے سے کیا ہوتا ہے' مولوی قدرت اللہ نے تو کچھ اور ہی پروگرام بنایا تھا۔ بی اے کے بعد میں ایم اے کروں گی۔ پھر پی ایچ ڈی' اسلامک اسٹڈیز میں۔ وہ مجھے کسی کالج کی پروفیسر اور پرنسپل دیکھنا چاہتے تھے۔" وہ ایک آہ بھر کے خاموش ہو گئی۔

ندیم نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا "برا مت ماننا۔ کیا وہ بھی عام باپ کی طرح تمہارے گلابی ہاتھوں کو پیلا کرنے کا نہیں سوچتے تھے؟"

بختاور کے چہرے پر حیا کا رنگ سا آ کے گزر گیا "ضرور سوچتے ہوں گے۔ لیکن انہیں گاؤں میں ایسا کوئی نظر نہیں آتا تھا' جس کے ساتھ میں خوش رہ سکوں۔ وہ کہتے تھے کہ جوڑے تو خدا آسمانوں پر بناتا ہے۔ ایک نہ ایک دن تیرے لیے بھی کوئی ملے گا۔ ہو سکتا ہے یہاں نہ ملے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن اب میں نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔"

ندیم نے اسے غور سے دیکھا "اب کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میں واپس ساجن پور جاؤں گی" اس نے بڑے عزم سے کہا۔

"اچھا! کب......؟" ندیم نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "کس کے پاس اور کس لیے؟ اور واپس ہی جانا تھا تو یوں فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ کچھ دکھی نظر آنے لگی "تم مذاق اڑا رہے ہو میرا؟"

ندیم نے اسے ہاتھ پکڑ کے اپنے سامنے ایک کرسی پر بٹھا لیا "جو کچھ میں نے اب تک تمہارے لیے کیا ہے' کیا وہ مذاق تھا۔ میں احسان نہیں جتا رہا ہوں......"

"اسی بھروسے پر تو میں نے یہ فیصلہ کیا ہے...... کہ میں واپس جاؤں گی اور اپنے والد کے قاتلوں کو بے نقاب کروں گی" وہ ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتی رہی۔

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا' جس میں ندیم سوچتا رہا کہ اسے کیا کہنا چاہیے جس میں نہ حوصلہ شکنی کا پہلو نکلتا ہو' نہ حوصلہ افزائی کا۔ فوری طور پر نہ وہ بختاور کو صحیح کہہ سکتا تھا اور نہ اس کے فیصلے کو جذباتی غلطی قرار دے سکتا تھا۔

"میں نے شہناز باجی کو سب بتا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے پورا یقین دلایا ہے کہ قاتل قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔ تم انہیں پہچانتے ہو' تم میری مدد کرو گے نا؟"

ندیم کہنا چاہتا تھا کہ آخر تم کیا سمجھتی ہو مجھے؟ میں سلطان راہی جیسا ولن ہوں جو کلاشنکوف یا ٹوکا لہراتا ہوا تمہارے دشمنوں سے بھڑ جاؤں یا آرنلڈ شیوازنگر کی طرح ساجن پور کو تہس نہس کر دوں؟ چہ پدی اور چہ پدی کا شوربہ۔ میں کیا اور میری اوقات کیا کہ میں چوہدری گلاب دین اور ان پیشہ ور قاتلوں سے لڑ جاؤں۔ بے شک اپنے علامہ اقبال نے فرمایا ہے لڑا دے ممولے کو شہباز سے مگر یہ ناچیز ممولہ یعنی ندیم عرف ڈاکٹر امجد بالکل خودکشی کے موڈ میں نہیں ہے۔

لیکن بختاور اسے دیکھ رہی تھی۔ دیکھے جا رہی تھی اور اس

پریشانی

کار ڈیلر کار کی خوبیاں گنواتے ہوئے کہہ رہا تھا "ارے جناب! اس گاڑی کے بارے میں تو کچھ پوچھیے ہی مت۔ اس کے انجن کی آواز تو سنائی ہی نہیں دیتی۔ گیئر بدلتے ہوئے آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ آپ کے ہاتھ نے حرکت کی ہے۔ سیٹیں ایسی آرام دہ...... کہ آپ محسوس کریں گے آپ اپنے گھر میں صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ گاڑی کے اندر آپ کو پیٹرول یا گیس کی ذرا سی بو محسوس نہیں ہو گی۔ کراچی کی سڑکوں کی حالت جیسی بھی ہے لیکن آپ کو اس گاڑی میں سفر کرتے وقت ذرا سا بھی جھٹکا نہیں لگے گا......"

"خدا کی پناہ......!" گاہک نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا "اگر یہ اس قسم کی کار ہے تو ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم کار میں گھر سے نکلے ہیں یا اسے گھر ہی بھول آئے ہیں؟"

کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ ندیم وہ سب نہ کہہ سکا جو وہ کہنا چاہتا تھا اور اسے کہنا چاہیے تھا۔ جو اس نے کہا وہ اس سے برعکس تھا۔ اس نے بڑی حیرانی کے ساتھ خود کو کہتے ہوئے سنا ''میں تمہارے ساتھ ہوں بختاور' ہر قدم پر' زندگی کے ہر مرحلے میں...... ہمیشہ......''

پھر دیکھتے دیکھتے جیسے سب کچھ بدل گیا۔ بختاور کی آنکھوں میں ناامیدی کے جذبات ممنونیت کے جذبات میں بدل گئے۔ اس کا جذبہ احسان مندی ایک پراعتماد غرور میں بدل گیا جس میں اپنائیت کا اقرار پوشیدہ تھا۔ اس کا اپنی بے چارگی اور کمزوری کا احساس ایک پرعزم قوت تسخیر میں ڈھل گیا اور کچھ کہے بغیر اس نے کہہ دیا۔ اس کی حیا آلود نظر نے' اس کی شرمگیں مسکراہٹ نے اور اس کے عارض کی شفق نے کہہ دیا کہ...... جب تم میرے ساتھ خوش ہو تو پھر مجھے ڈر کیسا' سارا زمانہ میرے ساتھ ہے۔ بختاور کی خوش بختی اس کے ساتھ ہے۔

☆☆☆

پیارے قارئین! ویسے تو ایک شہری بابو اور ایک گاؤں کی گوری کی داستان عشق کے موضوع پر ایک ہزار ایک سو ایک فلمیں بن چکی ہیں اور بنتی رہیں گی کیونکہ یہ سلسلہ یعنی عشق بلاخیز کا کاروان سخت جاں۔ چلتا رہے گا' فلمی روایات اور آپ کی توقعات کے مطابق تو اس کہانی کا انجام بھی ہیرو اور ہیروئن کے دنیاوی ملاپ کے کسی ایسے سین پر ہونا چاہیے جس کے پس منظر میں کوئی گانا یا اس کی دھن بج رہی ہو مثلاً ملنے والے مل کے رہیں گے' جلنے والے جلا کریں۔

اور ہاں' اس سے پہلے والے سین میں بدمعاش اور بدخواہ ولن کو ہمارے ہیرو کے ہاتھوں ایسی دھواں دھار مار پڑتی ہے کہ وہ اپنی ساری بدمعاشی بھول کے ناک سے زمین پر لکیریں بناتا ہے اور ہیروئن کو ہمشیرہ صاحبہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے سو پچاس لٹھ بردار اور ٹوکے گنڈاسے والی سپاہ اِدھر اُدھر ایسے پڑی ہوتی ہے جیسے کسی خوفناک طوفان کے بعد سائن بورڈ۔ ظالم سماج کی دیوار ایسے گر جاتی ہے جیسے کسی وزیر تعمیرات کے سالے ٹھیکے دار نے سیمنٹ سے پرہیز کرتے ہوئے کھڑی کی ہو۔

موسم گرما کی ایک حبس زدہ دوپہر کو جب ندیم اور بختاور چار پہیوں پر ڈگمگاتی چال کے ساتھ دوڑنے والے اس عذاب ناک فولادی پنجرے سے جسے بس کہا جاتا تھا' ساجن پور کے لاری اڈے پر اترے تو مٹی' دھول' پسینے' تھکن اور بے زاری سے ان کے چہرے اتنے مسخ ہو چکے تھے کہ انہوں نے اندازے کی بنیاد پر ایک دوسرے کو پہچانا۔

اس بس کے بیشتر مسافر اہالیان ساجن پور تھے اور ان میں بھی زیادہ تر ایسے تھے جو کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو کے ڈاکٹر صاحب کے دست شفا سے فیض یاب ہو چکے تھے یا بختاور کے والد مولوی قدرت اللہ مرحوم کے پیچھے کسی صف میں سجدہ ریز ہو چکے تھے۔

ندیم کا بس میں نظر آنا کوئی چونکا دینے والے بات نہیں تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ دوائیں وغیرہ لینے کے لئے ڈاکٹر صاحب شہر جاتے رہتے ہیں مگر ان کے درمیان بختاور کی موجودگی نے بڑی سنسنی پھیلائی تھی اور تمام حضرات و خواتین سارا راستہ اسے یوں گھورتے آئے تھے جیسے سیٹ پر کوئی دستی بم رکھا ہو یا کوئی خوں آشام بدروح بیٹھی ہو۔

ندیم اس خوف' نفرت اور پراشتعال رویے کا مطلب سمجھتا تھا۔ مولوی قدرت اللہ کو دوسرے جہان بھیجنے اور بھجوانے والوں کی طرف سے بختاور کو بدنام کرنے کے لیے ڈس انفارمیشن کی ایک شرمناک مہم چلائی گئی تھی کہ اپنے کسی آشنا سے مل کے اس نے اپنے باپ مولوی قدرت اللہ کو قتل کر دیا تھا اور اس کے ساتھ بھاگ کے شہر چلی گئی تھی۔ بعد میں سرکاری مولوی صاحب نے نماز جمعہ کے خطبے میں اس آبرو باختہ عورت کو جہنمی قرار دینے کے علاوہ یہ بھی ثابت کیا تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم دختران اسلام کے لیے دنیا و عقبیٰ میں گمراہی کا باعث روسیاہی ہوتی ہے اور چونکہ اس گناہ کبیرہ کے ارتکاب میں خود مولوی قدرت اللہ کی رضا شامل تھی اس لیے بیٹی کے ساتھ باپ کا ٹھکانا بھی جہنم ہی ہوگا۔

نتیجہ یہ کہ زیرلب سو طرح کی باتیں کرنے والے بس کے مسافر جب گاؤں پہنچے تو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مولوی قدرت اللہ کی مفرور بیٹی کے واپس آنے کی شرمناک خبر ہر کوچہ و بازار میں پھیلتی چلی گئی۔

ندیم نے مقفل دروازے والے مولوی قدرت اللہ کے گھر کو ایسے دیکھا جیسے وہ اس کا مدفن ہو۔ بختاور نے چابی سے اس قفل کو کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر چابی ندیم کو دے دی۔ اس کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا اور خوف سے رنگ سفید پڑ گیا تھا جیسے دروازہ کھلتے ہی وہ اپنے باپ کی لاش کو اوندھے منہ پڑا دیکھے گی۔ اس کا سر دو ٹکڑے ہوگا اور مغز کے ساتھ مل کے بہنے والا خون دہلیز پر جم گیا ہوگا۔ اپنے اشکوں کے سیل کو روکنے کی ناکام کوشش میں اس کی دیوانی آنکھیں ان بڑے پرنالوں کی طرح ٹپک رہی تھیں جو برسوں کی گرد و غبار سے اٹ گئے ہوں۔

ندیم نے دروازہ کھول کے آہستہ سے دھکیلا۔ عین دروازے کے سامنے جم کر سیاہ پڑ جانے والے بے کس و مظلوم لہو نے اپنی بے زبانی سے انصاف کا حق مانگنے کی کوشش کی مگر ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اندھے' گونگے اور بہرے بن کے گزر جائیں۔

ندیم نے بختاور کو ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ روتی رہی۔ ندیم ایک کمرے کے اس گھر کا جائزہ لیتا رہا جس میں مولوی قدرت اللہ نے زندگی کی نصف صدی اپنے یقین کے مطابق قرآن اور رسول کی تعلیمات سے لوگوں کو صراط مستقیم پر رکھنے کی کوشش میں گزار دی تھی۔ دیوار میں بنے ہوئے ایک طاق میں وہ سب کتابیں اسی طرح موجود تھیں جن سے مولوی قدرت اللہ رہنمائی حاصل کرتا تھا۔ نیچے والے دونوں شیلف ان دنیاوی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی مدد سے بختاور نے ایک دور افتادہ گاؤں میں اور ایک مولوی کی بیٹی ہونے کے باوجود یونیورسٹی کی سند حاصل کر لی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ اوپر تلے ٹین کے دو صندوق رکھے ہوئے تھے۔ شاید ان میں سے ایک میں روزانہ استعمال کے کپڑے ہوں گے اور دوسرے میں وہ جو مولوی قدرت اللہ نے بیٹی کی شادی کے لیے سلوا کے رکھے ہوں گے۔ ندیم نے سوچا۔ ممکن ہے اس میں تھوڑا بہت زیور بھی شامل ہو۔ جہیز تو نام ہے ماں باپ کے ارمانوں کا خواہ اس سے ایک کوٹھی بھر جائے یا صرف ایک ٹین کا صندوق بھرے۔ قدر و قیمت کے اعتبار سے کم کسی کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

کافی دیر بعد جب بختاور کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو مجبور ہو کے سسکیوں میں ڈھل چکے تھے' ندیم نے اسے پانی کے مٹکے سے ایک گلاس بھر کے دیا ''لو...... یہ پی لو...... اور چلنے کی تیاری کرو' ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔''

بختاور نے ابھی ایک گھونٹ ہی لیا تھا کہ لکڑی کے کمزور سے دروازے پر دل دہلا دینے والی دستک ہوئی۔ بختاور نے سہم کے ندیم کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارے سے بختاور کو تسلی دی اور ریوالور نکال کے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

ایک ساتھ چار افراد نے دروازے سے اس فوج کی سپاہ کی طرح اندر آنے کی کوشش کی جسے شہر مفتوحہ میں قتل عام کا شاہی فرمان موصول ہو گیا ہو۔ پھر چوہدری غلام رسول کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتا چنگھاڑتا اندر آیا۔ اس کے پیچھے تین حکم کے غلام تھے جن کے کندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ ندیم ان سب کی صورتیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ سب مولوی قدرت اللہ کے قاتل تھے۔

''ڈاکٹر! یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' غلام رسول فلمی ولن بن کے دہاڑا۔

ندیم نے اسے بے خوفی سے دیکھا اور مسکرایا ''وہی جو تمہیں نظر آ رہا ہے۔''

''تو میرا شک صحیح تھا۔ تو ہی اسے بھگا کے لے گیا تھا۔ تو نے ہی اس کے باپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے قتل کیا تھا۔ بڑی ہمت ہے بھئی تیری۔ اس کنجری کے ساتھ واپس آ گیا۔''

ندیم نے اطمینان سے ریوالور نکال لیا ''غلام رسول۔ آج تک جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ مولوی قدرت اللہ کی بیٹی بختاور اب میری بیوی ہے۔''

''بیوی؟'' خوف زدہ نظر نہ آنے کے لیے چوہدری غلام رسول نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور پھر تائید طلب نظروں سے اپنے مسلح محافظوں کی طرف دیکھا۔

''ہاں بیوی۔ اور جیسے تم اپنی بیوی کو گالی دینے والے کو گولی مار سکتے ہو۔ ایسے ہی میں بھی مار سکتا ہوں۔'' ندیم نے کہا ''گولی کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس نے ایک بھونکنے والے کتے کو مارا یا چوہدری غلام رسول کو۔''

ان سب کی ہنسی رک گئی۔ عین دروازے میں مولوی قدرت اللہ کے خاک نشین خون پر جوتوں سمیت رعونت کے ساتھ کھڑے ہوئے رائفل بردار تھوڑا سا ایک طرف ہو گئے

تبادلہ

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس کار خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے خاصی اچھی سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی ہے۔''

''دراصل وہ مجھے اپنے ہارمونیم کے بدلے مل گئی ہے جس پر میں روز رات کو ریاض کیا کرتا تھا۔''

''حیرت ہے! ایسے پرانے پھٹیچر ہارمونیم کے بدلے کس احمق نے آپ کو ایسی اچھی کار دے دی؟''

''سیکنڈ ہینڈ کاروں کا وہ ڈیلر اتفاق سے میرا پڑوسی ہے۔''

کیونکہ گاؤں کے کچھ اور عمائدین گناہ گار ندیم اور بختاور کے خلاف چشم دید گواہ بننے کے لیے اندر آ گئے تھے۔

ندیم اسی طرح ریوالور تھامے کھڑا رہا۔ بختاور اسی طرح اس کے پیچھے چھپی لرزتی رہی۔

تھانے دار نے کہا "ڈاکٹر امجد۔ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم نے مسماۃ بختاور دختر مرحوم مولوی قدرت اللہ کے ساتھ ناجائز مراسم استوار کیے۔ چونکہ وہ تمہارے ناپاک عزائم کی راہ میں حائل تھا اس لیے تم نے اسے قتل کر کے اپنی راہ سے ہٹا دیا اور بختاور کے ساتھ فرار ہو گئے۔"

تھانے دار کے ساتھ آنے والے مولوی نے کندھے پر پڑے رومال سے ناک صاف کی اور گنگنا کے بولا "تم دونوں عین حالت جرم میں اور ارتکاب گناہ عظیم کرتے ہوئے پکڑے گئے ہو۔"

ندیم نے اس کی طرف تھوک دیا "دو ٹکے کے ایمان فروش! تو ہی تھا نا جو اس رات قبر کھدوا رہا تھا۔ مگر تو پکڑا نہیں گیا تھا۔ اس لیے وفادار کتے کی طرح بھونک رہا ہے۔"

باہر کچھ اور لوگ آ گئے تھے۔ "ڈاکٹر زانی ہے" وہ چلا رہے تھے۔

"بختاور زانی ہے۔"

"زانیوں کو سنگسار کرو" وہ سب کرائے کے قاتل اور جنونی تھے۔ ان کے ہاتھ میں ڈنڈے تھے اور سریے اور پتھر۔ پتھر جو وہ دروازے پر مار رہے تھے اور مولوی قدرت اللہ کے مدفن پر برسا رہے تھے۔

ندیم کے جسم پر ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے بختاور کو اپنے پیچھے محسوس کیا اور دوسرے ہاتھ سے ریوالور کا رخ چوہدری غلام رسول کا نشانہ لیے کھڑا رہا۔

زندگی اور موت میں سے ایک کے انتخاب کا وقت آ گیا تھا۔ شرافت اور انسانیت کے علم کی سربلندی' حق و صداقت کی جیت' یقین محکم' عمل پیہم محبت فاتح عالم۔ سب کتابی باتیں پھر ایک سمندر پر تحریر ثابت ہوں گی۔ وہ کیا کرے گا؟ زیادہ سے زیادہ غلام رسول کو گولی مار دے گا۔ مگر اس کے بعد؟ مولوی قدرت اللہ کے اس بے گناہ لہو میں جواب پیروں تلے روندا جا رہا ہے' اس کا اور بختاور کا خون بھی شامل ہو جائے گا۔ رپورٹ میں لکھا جائے گا' پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے۔

ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دار و گیر!

اچانک خونخوار شور اور موت کی سنسناتی خاموشی میں ایک سائرن کی صدا ابھری۔ ندیم کے دل کی دھڑکن نے جیسے فرشتہ اجل سے ایک آخری اپیل کی۔ ایک موقع' ایک آخری موقع...... بس چند منٹ کی مہلت میرے خدا!۔

سائرن کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ پھر باہر سے کسی نے چلا کے کہا۔ "اوئے بھاگو! پولیس آ گئی" اور تب ندیم نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ ایس پی قمر الزماں کچھ دیر سے ضرور آیا تھا مگر آ گیا تھا۔

☆☆☆

چنانچہ میں...... یعنی وہ جو پہلے ندیم یا ڈاکٹر امجد تھا۔ اب پروفیسر ندیم امجد ہوں اور ایک کالج میں وہی مضمون پڑھاتا ہوں جو میں ساری عمر پڑھتا رہا تھا۔ میری آمدنی معقول ہے کیونکہ میں کالج کے بعد ٹیوشن سے بھی خاصا کما لیتا ہوں لیکن یہ بات بتاتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے' یہ ہے کہ میری بیوی یا نصف بہتر (جس کے بارے میں یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ وہ ناقص العقل اور پاؤں کی جوتی وغیرہ ہوتی ہے) سرکاری گریڈ کے اعتبار سے بھی مجھ سے آگے ہے اور بلحاظ علم بھی کیونکہ ایم اے کرنے کے بعد اس نے پی ایچ ڈی کرنے کا سوچا اور مقام عبرت ہے کہ کر لیا چنانچہ وہ ڈاکٹر بختاور ہیڈ آف دی اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ ہے اور اس کی تنخواہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ چھوٹا سا خوبصورت گھر جس میں ہم اپنے دو بچوں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہم نے اپنی مشترکہ آمدنی سے بچت کر کر کے بڑی مشکل سے بنایا ہے۔ ہمارے گھر کے پورچ میں ایک کار بھی کھڑی رہتی ہے جو تقریباً نئی ہی ہے یعنی صرف بیس سال پرانی ہے۔ اس شہر میں نظر آنے والی تیس سال پرانی گاڑیوں کے مقابلے میں تو نئی ہی ہوئی نا۔

ایک بار میں نے بختاور سے کہا کہ معلوم ہے' میں نے اپنی پیدائشی منگیتر کے سامنے کیا بڑ ماری تھی؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے سلطان زید کے رحیم یار خاں والے محل جیسا ایک محل بنواؤں گا اور تمہارے لیے ایک مرسیڈیز خریدوں گا۔ آٹومیٹک ائر کنڈیشنڈ۔ تو بختاور ہنسنے لگی تھی اور اس نے کہا تھا۔ آپ نے بڑ کہاں ماری تھی' جو کہا تھا پورا کر دکھایا۔ دونوں چیزیں ہیں میرے پاس۔

لیکن سب سے زیادہ شرم مجھے اس وقت آتی ہے جب دنیا مجھے جورو کا غلام کہتی ہے۔ کیونکہ یہ سچ ہے۔ الحمد للہ۔ اس کہانی کے باقی کردار بھی وہیں ہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے تھا۔ ساری بات تو منشائے قدرت کی ہے۔

